شفتالو کا پیڑ
علیم الحق حقّی

پیش لفظ

لیجئے قارئین ''شفتالو کا پیڑ'' پیش خدمت ہے۔

یہ محترم علیم الحق حقی کی دو طویل کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ہمیشہ کی طرح ہم نے آپ کے معیار اور پسند کو سامنے رکھ کر آپ کے لئے بہترین کہانیوں کا انتخاب کیا ہے۔ یوں تو حقی صاحب نے بے شمار موضوعات پر لکھا ہے' بہت لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ موضوع کا انتخاب ان کی ایک ایسی خوبی ہے جو انہیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز کرتی ہے۔

اس مجموعے کی پہلی کہانی ''شفتالو کا پیڑ'' محبت کی کہانی ہے اور یہ کہانی آج کے سلگتے موضوع کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جہاں آزادی کے متوالے شمع آزادی کو روشن رکھنے کے لیے بے دریغ اپنے لہو کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ آگ اور بارود کی بارش کے باوجود' ظلم و تشدد کے جلتے ہوئے ماحول میں اب بھی محبت کے پھول کھلتے ہیں اور اس لہو لہو وادی کو مہکاتے ہین۔ یہ ایک ایسی ہی محبت کی کہانی ہے جس نے آگ اور خون کے سائے میں جنم لیا اور نفرتوں میں پروان چڑھی۔ زندگی کی خوشیوں سے محروم بے رنگ زندگی گزارنے والی ایک ہندو لڑکی اور اپنے مقصد کی خاطر جان قربان کرنے والے مجاہد کی محبت کی دلگداز داستان۔ حقی صاحب نے ایک مجاہد کے دل میں پیدا ہونے والی فرض اور محبت کی کشمکش کو بڑی خوبی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔

اس مجموعے میں شامل دوسری کہانی "زمین کا گھاؤ" ایک ایسی کہانی ہے جس نے دو خاندانوں کے درمیان پیدا ہونے والی دشمنی کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ حسبِ نسب اور نسلی برتری کا خود ساختہ پیچ در پیچ سلسلہ ایک سیدھی سادی لڑکی کی پُرسکون زندگی میں ایک بھونچال پیدا کردیتا ہے۔ یہ پوری کہانی شروع سے آخر تک ایک ایسا سربستہ راز بن گئی جس کو جتنا کھولا گیا' اس کے رموز اتنے ہی بڑھتے گئے اور یہی اس کہانی کی خوبی ہے۔

خاندانی وقار اور جھوٹی انا کے درمیان ہونے والی سرد جنگ میں رشتوں کی راکھ اڑتی نظر آتی ہے۔ محترم علیم الحق حقی نے اس کہانی میں بڑے بانکپن سے محبت کو فاتح عالم کے منصب جلیلہ تک پہنچایا ہے.......... قدم قدم پر بل کھاتی ہوئی' لمحہ لمحہ ایک نئی کروٹ لیتی ہوئی یہ کہانی آپ کو مدتوں یاد رہے گی۔

ادارہ

یہ جو کہانی میں آپ کو سنا رہا ہوں' یہ کشمیر' جنت نظیر کی کہانی ہے۔ اب تو کشمیر کی جدوجہدِ آزادی اپنے کلائمکس کو پہنچ رہی ہے۔ میں جس عرصے کی بات کر رہا ہوں' اس وقت یہ دبی دبی چنگاری تھی۔ مجھے یہ کہانی کٹاری گاؤں کے اسکول ماسٹر نے سنائی تھی۔

میں بھی کشمیری سکھ ہوں۔ نام میرا رہنے دیجئے۔ یا جو جی چاہے نام دے دیں مجھے۔ ہم سکھ لوگ جو تحریکِ آزادیِ کشمیر کے حامی ہیں' اپنے خیالات کا کھلم کھلا اظہار نہیں کر سکتے۔ میں تو بڑا ہمت والا ہوں کہ یہ کہانی چھپوا رہا ہوں مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ اپنا نام بھی چھپواؤں۔

"ٹھہریں.......... ایک خیال آیا ہے مجھے۔ آپ سمجھ لیں کہ میرا نام پرتاپ سنگھ ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

ہاں تو یہ بات اس وقت کی ہے' جب حالات نے مجھے اپنی آبائی زمین بیچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کٹاری گاؤں میں ہماری پانچ کنال زمین تھی۔ میں باپو کی زندگی میں ہی وہاں سے چلا آیا تھا۔ میری شادی شہر میں ہوئی۔ پھر میں وہیں بس گیا۔ گاؤں کا خیال ہی نہ رہا۔ باپو کی موت کے بعد تو بالکل ہی ناتا ٹوٹ گیا۔ شہر میں میرا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ مگر خالصہ تحریک کے بعد حالات خراب ہوتے گئے۔ مجھے پیسوں کی ضرورت پڑی تو گاؤں یاد آیا۔ گاؤں کیا' گاؤں کی زمین یاد آئی۔ گاؤں کا آدمی شہر میں جا کر ایسا ہی خودغرض ہو جاتا ہے۔ وقت پڑتا ہے تبھی گاؤں کی یاد آتی ہے۔

میں اس بات کے حق میں ہوں کہ کشمیر میں استصوابِ رائے کرایا جائے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کشمیری پاکستان کے حق میں فیصلہ دیں گے۔ میں ہی نہیں' کشمیر میں آباد تمام سکھ یہی چاہتے ہیں۔ آپ کو یقین نہیں آ رہا نا؟ لیکن میں وجہ بتاؤں گا تو بات آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔ بات یہ ہے کہ بھارت اپنی پوری کوشش کے باوجود کشمیر میں ہندوؤں کی اکثریت نہیں بنا سکا۔ اکثریت مسلمانوں کی ہی ہے اور مسلمان پاکستان سے

الحاق چاہتے ہیں۔ آزادی انہیں بھارت نہیں دیتا۔ اقوام متحدہ ان کے لئے کچھ نہیں کرتا........ تو وہ سوائے اس کے کیا کر سکتے ہیں کہ اپنی آزادی کے لئے خود اٹھ کھڑے ہوں اور وہ اٹھتے ہیں تو بھارتی فوج انہیں کچلنے کی کوشش کرتی ہے۔ نتیجہ آپ جانتے ہیں کہ کیا نکلتا ہے۔ ہرے بھرے کھیت جھلس جاتے ہیں۔ کھلیانوں سے دھواں اٹھتا ہے۔ وادئ کشمیر میں زندگی ایک مسلسل ہڑتال بن جاتی ہے۔ گولیاں چلتی ہیں' خون بہتا ہے........ کاروبارِ زندگی معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ زمین کی قیمت کچھ بھی نہیں رہتی۔ بھارتی فوجی غذائی اجناس یوں لوٹتے ہیں جیسے وہ فرانس پر قابض جرمن فوجی ہوں۔ مقامی لوگ بھوکے مرتے ہیں اور فوجی عیش کرتے ہیں۔ نقصان صرف مسلمانوں کا نہیں' کشمیری سکھوں کا بھی ہوتا ہے اور ہندوؤں کا بھی۔ خوش حال گھروں میں بھی فاقے ہوتے ہیں۔ کشمیری سکھ جانتے ہیں کہ انہیں پھلنے پھولنے کے لئے جنگ نہیں امن چاہئے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں رواداری بہت ہے اور وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بھارتی فوج ان سے مفتوحین کا سلوک کرتی ہے چنانچہ اپنی بہتری کے لئے ان کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔

بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میں آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ حالات نے مجھے اپنی آبائی زمین فروخت کرنے پر مجبور کر دیا۔ زمین فروخت کرنے کے لئے مجھے کشمیر........ کٹاری جانا پڑا۔ پتا چلا کہ میری لاکھوں کی زمین کو کوئی خریدار میسر نہیں۔ بے یقینی میں مبتلا لوگ زمین کیا خریدیں گے۔ حالات اچھے ہوتے تو میری زمین سرینگر ہی میں فروخت ہو جاتی۔ مایوس ہو کر میں نے کٹاری کا رخ کیا کہ شاید وہاں کوئی گاہک لگ جائے۔

وہ موسمِ گرما کا ایک دن تھا۔ مگر گرمی زیادہ نہیں تھی۔ بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے ہمارے گاؤں میں مسئلہ گرمی نہیں' سردی ہوتی ہے۔ میں ایسے جانے پہچانے راستوں پر چل رہا تھا جنہیں میں کب کا بھلا چکا تھا۔ مگر اب وہ مجھے یوں یاد آ رہے تھے' جیسے میں ہر روز ان پر سے گزرتا رہا ہوں۔ حالانکہ وہ بہت پرانی بات تھی۔ میں چودہ سال کی عمر تک کٹاری میں رہا تھا۔ پھر کالج میں داخلے کے سلسلے میں شہر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد سال میں ایک بار' دو چار دن کے لئے آ جاتا تھا۔ باپو کی موت کے بعد یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا اور اب بیس سال بعد میں واپس آیا تھا۔

کٹاری ہوٹل کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا' باہر کرسیاں ڈالے آٹھ دس بھارتی فوجی بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جام تھے۔ وہ بہت بے زار نظر آ رہے تھے۔ آپس میں بھی بات نہیں کر رہے تھے۔ مقامی لوگوں کو دیکھتے تھے تو ان کی نظروں سے نفرت سی ٹپکنے لگتی۔ انداز ایسا ہوتا جیسے ان کے نزدیک وہ سب مشکوک افراد ہوں۔

دنیا میں سب سے تکلیف دہ عمل ماضی میں دوبارہ جینا ہے۔ میں اس وقت اسی اذیت سے گزر رہا تھا۔ یہ وہ گلیاں تھیں جہاں میں کبھی بچپن میں کھیلا کرتا تھا۔ میں اپنے آبائی مکان سے گزرا۔ اب وہاں اجنبی لوگ رہ رہے تھے۔ میں نے باپو کے انتقال کے بعد مکان بیچ دیا تھا۔ مجھے وہاں رہنا نہیں تھا اور مکان میں خالی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس بار میں گاؤں نہیں آیا تھا۔ جان سے عزیز کوئی چیز بیچنا بہت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ تب میں کم عمر تھا' مجھ میر وہ تکلیف اٹھانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ زمین میں نے باپو کی نشانی سمجھ کر رہنے دی تھی لیکن اب.........

مگر اب میرے دل میں عجیب سی تڑپ ابھر رہی تھی۔ اپنی زمینوں کو دیکھنے کے لئے دل مچل رہا تھا۔ میں تیز قدم اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر جانی پہچانی زمین جیسے پاؤں تھامے لے رہی تھی۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ برسوں کے بعد آئے ہو۔ اپنے قدموں کے نشان تو دیکھ لو' جو بظاہر مٹ چکے ہیں مگر میں نے اپنے اندر بہت سنبھال کر رکھے ہیں۔ دھرتی کی یہ آواز میرے اندر گونج رہی تھی۔

وہ صبح کا وقت تھا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ میں پتلی پگڈنڈی پر چل رہا تھا۔ جس کے اطراف میں سبزہ ہی سبزہ تھا۔ ایک عجیب سی خواہش میرے اندر مچلی۔ میں نے جوتے اتار کر ہاتھ میں لے لئے اور پگڈنڈی چھوڑ کر سبزے پر چلنے لگا' جس پر ابھی تک شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ میرے پیروں کے تلوؤں کے راستے جسم میں خوش گوار ٹھنڈک اترنے لگی۔ وہ لمس بے حد فرحت بخش تھا۔

میں جوتے ہاتھ میں لئے پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ سبزے پر چلتا رہا۔ مکان خاصے فاصلے پر بنے تھے۔ ہر دو مکانوں کے درمیان کھیت یا باغ تھے۔ دائیں جانب پہاڑ تھے۔ اس طرف سبزے کے درمیان ایک چوڑا کچا راستہ تھا۔ اس پر پہیوں کے نشان بھی تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بیل گاڑیاں وہاں چلتی تھیں۔ میرے بچپن میں وہاں کچا راستہ نہیں تھا۔

بائیں جانب ایک چھوٹے سے لیکن صاف ستھرے مکان کے دروازے پر ایک شخص نمودار ہوا۔ وہ بڈھا آدمی تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی تھی۔ چہرے کے خدوخال میں نرمی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ مجھے وہ کوئی ریٹائرڈ اسکول ماسٹر لگا۔

"کیا بات ہے بیٹے؟ کس سے ملنا ہے؟" اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"یہ......... ادھر سامنے میری زمین ہے۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔" میں نے بتایا۔

اُس نے چونک کر ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور مجھے غور سے دیکھا۔ اس کی بھنویں کھنچ سی گئی تھیں۔ پھر اُس کی آنکھوں میں شناسائی سی چمکی، ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ سی ابھری۔ وہ میری طرف بڑھا اور گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "تو یہ تم ہو پرتاپ! نالائق لڑکے کیا مجھے بھول گئے؟" اس کے لہجے میں ملامت تھی۔

میں نے اُسے بہت غور سے دیکھا۔ وہ بوڑھی آنکھیں، استخوانی چہرہ، دانتوں سے محروم دہن اور وہ استخوانی ہاتھ جو میرے ہاتھ کو گرفت میں لئے ہوئے تھا......... اس میں گنگا دھر جی کی کوئی مشابہت نہیں تھی۔ گنگا دھر ہمارے ریاضی کے پرانے استاد، جنہیں مجھ پر بہت غصہ آتا تھا۔ وہ عموماً مجھ سے خفا رہتے تھے اور میں ان سے خوف زدہ۔ مگر مشابہت نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے انہیں پہچانا تو "نالائق لڑکے" کہتے ہوئے اُن کے لہجے کی وجہ سے۔ اُن کی آواز اب بھی پہلے جیسی کڑک تھی اور لہجہ وہی بارعب۔

وہ بوڑھے ہو گئے تھے لیکن ابھی تک چاق و چوبند تھے۔ وہ ایسے بااصول شخص تھے جس نے زندگی میں کبھی سگریٹ اور چائے تک کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ تو صرف تازہ قوت بخش ہوا کے گھونٹ پیتے تھے۔ وہ ہماری اس نسل کے نمائندے تھے جس نے لگے بندھے اصولوں کے تحت گزاری ہے۔

"سر......... کیسے ہیں آپ؟" میں نے کہا۔

"تو تم نے پہچان لیا گنگا دھر کو؟"

"جی سر، کیوں نہ پہچانوں گا۔ آپ کی جوتیاں سیدھی کرنے کے طفیل تو میں پڑھا لکھا کہلاتا ہوں۔"

وہ خوش نظر آنے لگے۔ پرانے استادوں کو اپنے شاگردوں کی سعادت مندی بہت اچھی لگتی ہے۔ "بڑے ہو کر اچھے ہو گئے ہو پرتاپ۔ ورنہ مجھے یاد ہے بچپن میں تم بہت

نالائق ہوتے تھے۔" انہوں نے کہا۔ "اور سناؤ کیسے بھول پڑے؟"

"بس سر، وقت اور حالات کی سختیوں سے گھبرا کر یہاں آیا ہوں۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا پُتر۔"

"میں زمین کا سودا کرنے آیا ہوں۔"

"کیا؟ پُرکھوں کی زمین بیچو گے؟" وہ ملامت بھرے لہجے میں چیخے۔ "ماں باپ کی ہڈیاں فروخت کرو گے؟" اُن کی نظروں میں بھی میرے لئے ملامت تھی۔ انہوں نے میرا ہاتھ بھی چھوڑ دیا جو اب تک تھامے ہوئے تھے۔

اسی لمحے دس بارہ سال کی ایک لڑکی گھر کے اندر سے ایک کرسی اٹھائے ہوئے آئی اور دروازے کے سامنے رکھ دی۔ "باپو میں اور کرسی لا رہی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ گھر میں چلی گئی۔

گنگا دھر جی مجھے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ تاہم انہوں نے خوش اخلاقی سے مجھ سے کہا۔ "اندر آ جاؤ پرتاپ۔ برسوں بعد اپنے دیس واپس آئے ہو۔ اپنی زمین تک جاؤ گے تو اجنبیت کا احساس تمہیں بہت دکھ دے گا۔ بہتر ہے، یہاں سے تازہ دم ہو کر آگے جاؤ۔ آ جاؤ......... آ جاؤ۔"

لڑکی اتنی دیر میں، ایک اور کرسی لے آئی تھی۔ میں شرمندہ سا لکڑی کا گیٹ پار کر کے باغیچے میں داخل ہوا۔ میرے قدموں میں ہچکچاہٹ تھی۔ اُس بچے کی طرح جسے اس کے استاد نے بھری کلاس میں پھٹکارا ہو اور وہ یہ بھی جانتا ہو کہ غلط نہیں پھٹکارا گیا ہے۔

"بیٹھو پُتر!" اس بار گنگا دھر جی کے لہجے میں شفقت تھی۔

"سر۔ پہلے آپ تشریف رکھیں۔" میں نے عاجزی سے کہا۔

وہ بیٹھ گئے۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ میں نے باغیچے کا جائزہ لیا۔ وہاں پھل دار درخت بھی خوب تھے اور گلابوں کی کیاریاں بھی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر مہکتی ہوا پھیپھڑوں میں بھرلی۔ اندر جیسے روشنی ہو گئی۔ سینہ اس جانی پہچانی تازگی سے بھر گیا جسے میں بھول چکا تھا۔

"میں نے شاید تمہیں زیادہ ہی ڈانٹ دیا۔" گنگا دھر جی بولے۔ اُن کے لہجے میں

معذرت تھی۔

اس بار لڑکی چھوٹی سی ایک میز اٹھا لائی۔ میز دونوں کرسیوں کے درمیان رکھ کر وہ پھر گھر میں چلی گئی۔

"آپ نے غلط نہیں ڈانٹا سر، لیکن............"

"میں سمجھتا ہوں۔ جانتا ہوں۔" انہوں نے میری بات کاٹ دی۔ "آج کل حالات ہی ایسے ہیں۔ ہر شخص پریشان ہے۔ زمینیں تو یہاں بہت تیزی سے بک رہی ہیں۔"

میں نے ممنونیت سے انہیں دیکھا۔ "یہی بات ہے سر!" میں نے کہا اور پھر انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

لڑکی لسی کا ایک جگ اور دو بڑے گلاس اٹھا لائی تھی۔ اس نے دونوں گلاس بھرے اور ہمارے سامنے رکھ دیئے۔

گنگا دھر جی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میری آنکھوں میں اپنے بچپن کی تمام روشن صبحیں پھِر گئیں۔ میں اس وقت اپنے بچپن میں جی رہا تھا۔ بستہ کندھے سے لٹکائے پگڈنڈی پر دوڑتا اسکول جا رہا تھا۔ کلاس میں شرارتیں کر رہا تھا۔ ہوم ورک نہ کرنے پر پٹ رہا تھا۔

میں نے لسی کا گلاس خالی کر کے رکھا۔ گنگا دھر جی نے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اشارے سے انہیں منع کر دیا۔ "میں ناشتا کر کے چلا ہوں سر۔"

میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ کچھ فاصلے پر سامنے کی طرف کبھی ایک اصطبل تھا۔ مگر اب وہاں اینٹوں کا مکان تعمیر ہو رہا تھا۔ اس کے برابر ایک اور پکا مکان تعمیر ہو رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی تبدیلیاں ہر طرف آ رہی تھی۔ مگر کرنل کا کاٹیج ویسے کا ویسے ہی تھا۔ بس اس کے باغیچے میں خود رو جھاڑیاں بے تحاشا اگی ہوئی تھیں۔ ان جھاڑیاں نے گیٹ تک کو گھیرا ہوا تھا۔ اندر جانے کا راستہ بھی نہیں تھا۔

اس کاٹیج کو دیکھ کر مجھے کرنل اجیت یاد آیا، اس کی زبردستی زیادتی یاد آئی اور میرا دل نفرت سے بھر گیا۔ کرنل اجیت کشمیری تھا لیکن ہندوستانی فوج میں تھا۔ وہاں رہ کر ایسا بددماغ اور مغرور ہو گیا تھا کہ کشمیریوں کو اپنی رعایا سمجھتا تھا۔ ہماری زمینوں کے ساتھ اس کی تین چار کنال زمین تھی۔ مگر اُس نے ہماری زمین سے پانچ کنال زمین ہڑپ کر لی تھی

اور ہم کچھ بھی نہیں کر سکے تھے۔ پٹواری کو معلوم تھا کہ وہ ہماری زمین ہے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات اس نے ہمیں سمجھا بھی دی تھی کہ اس کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں لیکن زمین ہمیں نہیں مل سکتی۔ یہ سب کچھ مجھے باپو سے معلوم ہوا تھا۔

کاٹیج دیکھ کر میرے پرانے زخم ہرے ہو گئے۔

گنگا دھر جی نے میری نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور مسکرا دیئے۔ "میرا خیال ہے، تمہاری پانچ کنال زمین تو یہاں بھی ہے۔" وہ بولے۔

"ہے نہیں، تھی کہئے۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "ہماری وہ زمین کرنل نے ہڑپ کر لی ہے۔"

"کر لی ہے نہیں کر لی تھی کہو۔" وہ مسکرا دیئے۔ "اس اعتبار سے تم بڑے موقع سے آئے ہو۔ پٹواری سے مل لو تو تمہاری زمین تمہیں واپس مل سکتی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "وہ کیسے؟"

"کرنل مر چکا ہے۔"

"کیسے؟"

"مجاہدین کے ساتھ ایک خون ریز جھڑپ میں مارا گیا۔"

مجھے کرنل کی بیوی یاد آ گئی۔ میں نے اسے اُس وقت دیکھا تھا جب میں چھوٹا سا بچہ تھا اور اسکول میں پڑھتا تھا۔ اس بات کو اب چوبیس سال ہو چکے تھے۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ کاٹیج کو دیکھتے ہی مجھے سمجھ لینا چاہئے تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ کاٹیج کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ طویل عرصے سے ویران پڑا ہے۔ احاطے سے کاٹیج کے دروازے تک جانے والے راستے کو جھاڑیوں نے نگل لیا تھا۔

"یہ کاٹیج تو ویسے کا ویسا ہی ہے۔ بس ویران لگتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کرنل کی بیوی کے متعلق تمہیں یاد ہے؟"

مجھے یاد تھا۔ ان دنوں میرے ذہن میں جادوگروں، دیوؤں اور پریوں کی کہانیاں بری طرح گھسی ہوئی تھیں اور ان تمام مخلوقات کو میں نے کرنل کے کاٹیج سے منسوب کر رکھا تھا۔ ایک روز میں نے کاٹیج میں ایک جیتی جاگتی عورت کو دیکھا۔ میں وہاں پھل توڑنے کی نیت سے گیا تھا اور چھپتا چھپاتا شفتالو کے بڑے درخت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ درخت

درحقیقت ہمارا تھا۔ ہماری زمین پر تھا۔ اس زمین پر جو کرنل نے غصب کرلی تھی۔ اس بڑے درخت پر بہت زیادہ پھل اترتا تھا۔ کٹاری میں شفتالو کا اس جیسا درخت دوسرا نہیں تھا۔

تو میں چھپتا چھپاتا اس درخت کی طرف بڑھ رہا تھا کہ مجھے وہ عورت نظر آئی۔ وہ کاٹیج کے دروازے کے باہر ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے کھلے بال نیچے لٹک رہے تھے۔ تقریباً زمین کو چھو رہے تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مجھے وہ جادوئی دنیا کی کوئی مخلوق لگی۔ اسے دیکھا تو میں خوف سے منجمد ہو کر رہ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس دنیا کی مخلوق ہرگز نہیں ہے۔

اسی وقت اس نے سر گھمایا۔ مجھے اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں نظر آئیں۔ ان میں عجیب سی نرمی اور گہری اداسی تھی۔ میں نے خوف زدہ ہو کر ایک چیخ ماری اور اندھا دھند وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

میں نے آ کر ماتا جی کو بتایا۔ میرا خوف دیکھ کر چند لمحے کو تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔ پھر کچھ سوچا اور مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”ارے کچھ بھی نہیں۔ وہ اس منحوس کرنل کی بیوی ہو گی۔“

پھر میں نے اُس عورت کو اپنے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ مگر اُس کی خوبصورتی مجھے اس وقت بھی دیومالائی لگی۔

کرنل اجیت مجھے بہت اچھی طرح یاد تھا۔ میرا خیال ہے اس زمانے میں وہ شاید کیپٹن تھا۔ یہ وہی عرصہ تھا جب اُس نے ہماری زمین پر ہاتھ صاف کیا تھا۔ مجھے یاد ہے، اس سے سبھی خوف زدہ رہتے تھے۔ خاص طور پر بچے۔ ہم کاٹیج کے قریب کھیلتے تھے اور جب بھی کرنل کی آواز سنائی دیتی تو ہم گھبرا کر بھاگ لیتے۔ وہ ڈانٹتا ہی بہت زور سے تھا۔

اُس وقت کرنل کی عمر چالیس رہی ہو گی۔ وہ بھاری بھرکم آدمی تھا۔ گردن ندارد تھی۔ سر لگتا تھا کندھوں پر رکھا ہے۔ اسے گالیاں انگریزی میں بکنے کا بہت شوق تھا۔ 65ء کی جنگ میں بم کا ایک ٹکڑا اس کے ایک کولہے میں پیوست ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ جزوی طور پر معذور ہو گیا تھا یعنی لنگڑا کر چلتا تھا ممکن ہے اس کے چڑچڑے پن.......... بلکہ جھگڑالو پن کا سبب کسی حد تک یہ بھی ہو۔ بہرحال اردگرد کے لوگ اس سے عاجز تھے

مگر اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے تھے۔

”مجھے کرنل کی بیوی یاد ہے۔ میں باپو کی موت پر یہاں آیا تو وہ مرچکی تھی۔“ میں نے کہا۔

”ارے میں اُس کی نہیں، کرنل کی دوسری بیوی کی بات کر رہا ہوں۔“ گنگا دھر جی بولے۔

”دوسری بیوی؟ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ کرنل نے دوسری شادی کی تھی!“ میں نے حیرت سے کہا۔

”دوسری بیوی کی کہانی تو گاؤں کے بچے بچے کو معلوم ہے۔ میں تمہیں سناتا ہوں۔“ گنگا دھر جی نے کہا۔ ”کرنل کا مزاج ایسا تھا کہ..........“

☆=====☆=====☆

کرنل اجیت کا مزاج ایسا تھا کہ وہ خود کو دوسرے، عام لوگوں سے بہت بلند سمجھتا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہوتا تھا کہ جیسے وہ آقا ہو اور باقی سب اُس کے غلام۔ اس نے تمہارے باپ کی زمین چھینی اور اس کا مالک بن بیٹھا۔ اس نے زمین کے گرد خاردار تاروں کی باڑھ لگوائی۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اپنے اردلی سے باڑھ میں بجلی کا ایک تار بھی لگوا لیا، جس سے ایک گھنٹی منسلک تھی۔

اردلی لمبا تڑنگا دہقان تھا۔ انہی دنوں رنڈوا ہوا تھا۔ ہر وقت اس چمگادڑ کی طرح پلکیں جھپکتا رہتا تھا جو غلطی سے دن کے وقت باہر نکل آئی ہو۔ اس کی بڑی بڑی مونچھیں نیچے کی طرف جھکی رہتی تھیں۔ کرنل کا وہ ایسا تابع دار تھا کہ اس کے کہنے پر کچھ بھی کر سکتا تھا۔

جس سال کی یہ بات ہے، اس سال بارش بالکل نہیں ہوئی تھی۔ پانی کی زبردست قلت تھی۔ چشموں کے پاس عورتوں کے گھڑوں اور برتنوں کی لمبی قطار ہوتی۔ اگلی صبح کے لئے شام سے ہی برتن وہاں رکھ دیئے جاتے لیکن بیشتر چشمے خشک ہو گئے تھے۔ بعض اوقات پانی کی باری پر جھگڑے بھی ہوتے۔ دکانیں صرف گھنٹے دو گھنٹے کے لئے کھلتیں۔ پھر ہیضے کی وبا پھیل گئی۔ ڈاکٹر ابلا ہوا پانی پینے کا مشورہ دینے لگے۔ لوگ چڑتے تھے کہ پانی ملتا ہی کتنا ہے کہ ابالنے کی زحمت کی جائے۔

اس عرصۂ ابتلا میں کرنل اپنی بیوی کو سری نگر سے کٹاری لے آیا۔ حالات یہاں بھی ویسے ہی تھے مگر گرمی اتنی جان لیوا نہیں تھی۔ کرنل کا کاٹیج بہت ٹھنڈا تھا۔ وہ برآمدے میں شاہ بلوط کے سائے میں بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ اس درخت پر ایک اُلّو کا بسیرا تھا۔ کرنل نے جمنا نامی ایک دہقان عورت کو ملازم رکھ لیا تھا۔ وہ صبح سویرے آتی' گھر کا کام کاج نمٹاتی اور دوپہر کو واپس چلی جاتی۔

کرنل ہیضے سے بہت بری طرح خائف تھا۔ کاٹیج کے اندر اس کے اور اس کی بیوی کے سوا کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ جمنا اپنے کپڑے باہر اتارتی اور کرنل کی بیوی کے پرانے کپڑے پہن کر اندر جاتی اور گھر کا کام کرتی۔ کرنل شام کو اپنی جیپ میں واپس آتا۔ وردی اتار کر بیوی کے دیئے ہوئے کپڑے پہن کر وہ ابلے ہوئے پانی میں آیوڈین کے چند قطرے ڈال کر پیتا۔

انہیں کاٹیج میں شفٹ ہوئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ کرنل کے ایک شفتالو کے درخت پر ڈاکا پڑا۔ چور رات کے وقت آیا تھا اور اس کی آمد کا کسی کو پتا نہیں چلا تھا۔ کرنل تو غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اپنے شفتالو کے پیڑ اسے بہت عزیز تھے۔ وہ ان پر فخر کرتا تھا۔ اس نے اردلی کو ہدایت کی کہ اب وہ باغ میں ہی سوئے۔ چور کو پکڑنا اس کی ذمے داری ہے۔

وہ بہت کٹھن وقت تھا۔ دیہاتی لوگ اور بھوکے بچے آئے دن باغوں سے پھل توڑتے...... چراتے تھے۔ انہیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ پھلوں کے ذریعے انہیں کسی اور کے ہیضے کے جراثیم لگ سکتے ہیں۔

اس پر ستم یہ کہ کیمپ میں بے شمار قیدی موجود تھے' جن سے بیگار لی جاتی تھی۔ کشمیر میں بیگار کا دستور بہت پرانا ہے۔ کسی بھی مسلمان کو باغی کہہ کر پکڑ لیا جاتا ہے اور اس سے مشقت کرائی جاتی ہے۔ ایسے قیدی آئے دن فرار ہوتے رہتے ہیں۔ فوجیوں کو ان کی پروا بھی نہیں ہوتی۔ ایک قیدی فرار ہوتا ہے تو وہ اپنے لئے دو قیدیوں کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ بھاگے ہوئے قیدی اپنی ضرورت کے تحت کھانے پینے کی چیزیں' کپڑے اور بعض اوقات اوزار تک چُراتے ہیں۔ کبھی ان میں سے کوئی بدنصیب بھارتی گارڈز کی گولیوں کا نشانہ بھی بن جاتا تھا۔ ایسے میں لاش کئی دن تک کھلی پڑی رہتی...... کسی کی

ہمت نہ ہوتی کہ اسے دفن کر دے۔

دوپہر کے بعد اردلی شفتالو کے درختوں کے لئے پانی کا بندوبست کرنے نکلتا۔ پانی کی تلاش میں اسے دور دراز سفر کرنا پڑتا۔ کیونکہ بیشتر چشمے سوکھ چکے تھے اور جو رہ گئے تھے اُن میں سے بھی کوئی نہ کوئی ہر روز خشک ہو جاتا تھا۔ یہی وہ وقت ہوتا تھا جب کرنل کی بیوی تنہا ہوتی تھی۔ اس کا نام لاجونتی تھا۔

سہ پہر کے اس اونگھتے وقت میں درختوں کے سائے سمٹنے لگتے تھے۔ دھوپ تیز ہو جاتی تھی۔ ہر چیز پر اداسی مسلط ہو جاتی تھی۔ اس وقت لاجونتی برآمدے میں بیٹھ کر سلائی' بُنائی کرتی یا کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ عمر چھبیس ستائیس کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ پکے ہوئے پھل کی طرح پُرکشش تھی۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں سختی اور سرد مہری جھلکتی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ اولاد سے محروم عورت تھی۔ اس پھل دار درخت کی طرح جو پھل سے محروم ہو۔

"میں تو سمجھتا تھا کہ اس کے سینے میں دل ہی نہیں ہے۔" گنگا دھر جی نے مجھے بتایا۔
"لیکن میری بیوی کہتی تھی...... تم غلطی پر ہو۔ بعد میں مجھے خود پتا چل گیا۔"

☆=====☆=====☆

لاجونتی کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں تھی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ کرنل اجیت سخت مزاج آدمی تھا۔ حسِ ظرافت اس میں نام کو نہیں تھی۔ اس پر عمر کا فرق۔ اس کی قربت نے لاجونتی کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا۔ وہ اس خوشی سے واقف ہی نہیں تھی جو کسی جوان عورت کو کسی کی محبت دیتی ہے۔

وہ اپنے گاؤں کی حسین ترین لڑکی تھی۔ گاؤں کا ہر جوان اس کے قرب کی آرزو کرتا تھا۔ اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی اور پھر گاؤں کے اسکول میں پڑھانے لگی تھی۔ اس کا قصور بس یہ تھا کہ وہ غریب گھرانے کی لڑکی تھی۔ کرنل نے رشتہ بھیجا تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ فوجیوں کا شمار دیہاتوں میں امراء میں ہوتا ہے۔ وہ رنڈوا تھا' اس کی عمر زیادہ تھی لیکن وہ فوجی بھی تھا اور صاحبِ جائیداد بھی۔ لاجونتی اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پھر غربت کا ذائقہ وہ خوب چکھ چکی تھی۔ اس نے سوچا چلو کچھ نہیں غربت سے نجات اور خوش حالی تو میسر

آئے گی۔

ابتدا میں تو وہ بچوں کی آس لگائے بیٹھی رہی۔ مگر چار سال بعد اُس نے اس حقیقت کو قبول کرلیا۔ اس نے تسلیم کرلیا کہ یہ بے رس اور خوشی سے محروم زندگی اس کا مقدر ہے جس کے لئے اس نے اپنی جوانی اور حُسن کا سودا کیا تھا۔

دن کے بیشتر حصے میں اس کے لئے تنہائی ہی تنہائی تھی۔ وہ بے وقعتی کے ناقابلِ اظہار بوجھ تلے دبی کراہتی رہتی تھی۔ دل بہلانے اور وقت گزارنے کے لئے اس کے پاس کتابوں یا شوہر کی لائی ہوئی خبروں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ ایک بنجر زندگی گزار رہی تھی۔

کرنل اجیت ہمیشہ اسے بری ہی خبریں سناتا تھا لیکن ان خبروں سے لاجونتی کو بڑا سکون ملتا تھا۔ محروم لوگوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ دوسروں کے دکھ او پریشانیاں ان کے لئے خوشی کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ سوچتے ہیں' ہم خوش نہیں تو کوئی اور کیوں خوش ہو۔

وہ سہ پہر کا وقت تھا۔ دھوپ سے چٹخی ہوئی زمین پر شاہ بلوط کا سایہ پرچم کی طرح لہرا رہا تھا۔ لاجونتی برآمدے میں آرام کرسی ڈالے بیٹھی تھی۔ کرنل اجیت کو گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ جمنا جا چکی تھی۔ اردلی پانی کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ ہوا میں تندی تھی' باغیچے کی طرف سے ایک جھینگر کی آواز آرہی تھی جو شام کی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔

اچانک لاجونتی کو گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی چور باغ میں گھسا ہے۔ لاجونتی کو اکثر یہ خیال آیا تھا کہ اگر کوئی چور ان اوقات میں باغ میں گھس آیا جب وہ اکیلی ہوتی ہے تو وہ کیا کرے گی لیکن وہ آسانی سے خوف زدہ ہونے والی نہیں تھی اور پھر کٹاری کے کیمپ کمانڈنٹ کے گھر میں دن دیہاڑے گھسنے کی ہمت کون کر سکتا ہے۔

ایک ہفتہ پہلے کچھ لڑکے باغ میں گھس آئے تھے۔ اس نے انہیں خوب ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا تھا۔ یہی نہیں' اس نے پڑوس میں رہنے والے اسکول ماسٹر کو بھی بلا لیا تھا۔ اسکول ماسٹر گنگا دھر گاؤں کا واحد آدمی تھا جس کے کرنل سے خوش گوار تعلقات تھے۔

گھنٹی کی آواز سننے کے بعد لاجونتی نے بڑی کاہلی سے اپنے سلیپر قریب کھسکائے اور انہیں پہن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ باغ کی طرف چل دی لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا۔

شاخوں پر لدے ہوئے سرخ شفتالو دھوپ میں چمک رہے تھے' بیلوں کے پتے سنہرے لگ رہے تھے۔

اُس نے سوچا' کوئی کتا باڑھ پار کر کے اندر گھسا ہو گا۔ بھوکے کتے بہت پریشان کرتے تھے۔ کتے کو باہر نکالنا ضروری تھا۔ یہ سوچ کر وہ باغ والے راستے پر اور اندر کی طرف چل دی۔ ہوا اسے بہت گرم لگ رہی تھی۔ سلیپر کے باوجود اسے اپنے پیر زمین کی تمازت سے جلتے محسوس ہو رہے تھے۔

لیکن اسے کہیں کوئی کتا نظر نہیں آیا۔ نہ بیل کا کوئی پتا لرز رہا تھا نہ کسی خشک ٹہنی کے پیروں تلے آکر تڑخنے کی آواز تھی۔ شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے سوا وہاں سناٹا تھا۔

"ہش ہش.......... دفع ہو جا کتے۔" وہ احتیاطاً چلّائی۔

اسکول ماسٹر گنگا دھر نے بھی گھنٹی کی آواز سن لی تھی۔ اس کا باغ کرنل کے باغ کے سامنے ہی تھا۔ وہ باہر نکل آیا۔ جانتا تھا کہ اس وقت لاجونتی گھر پر اکیلی ہے۔ اس نے سوچا ممکن ہے اسے مدد کی ضرورت ہو۔

گنگا دھر کو لاجونتی باغ میں جانے والے راستے پر آگے بڑھتی نظر آئی۔ کبھی کبھی وہ بیلوں کو ہٹا کر جھانکتی تھی۔ وہ باریک ریشمی کپڑے کی انگوری رنگ کی ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ بلاؤز جامنی رنگ کا تھا۔ دھوپ اس کے بالوں میں چمک رہی تھی۔ وہ کچھ بے چین بلکہ متوحش نظر آرہی تھی۔ وہ شفتالو کے درختوں کے قریب پہنچی تو اچانک اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

گنگا دھر دہل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں سانپ بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ کرنل کی بیوی نے کوئی سانپ دیکھ لیا ہے۔ مگر فوراً ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔

"باہر نکلو۔" لاجونتی چلّائی۔ "فوراً باہر نکل آؤ۔"

گنگا دھر بھی تیزی سے اس طرف لپکا۔

ذرا دیر بعد لاجونتی اور گنگا دھر دونوں متعجب کھڑے تھے۔ بیلوں میں چھپا ہوا جوان آدمی باہر نکل آیا تھا اور اُن کے سامنے سر اور نگاہیں جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے کپڑوں میں پیوند ہی پیوند لگے تھے۔ وہ یقینی طور پر کیمپ کے ان قیدیوں میں سے تھا جن سے بیگار لی

جاتی ہے۔ وہ کسرتی جسم کا مالک تھا۔ چہرے کی رنگت جھلسی ہوئی تھی۔ سیاہ گھونگھریالے بال لگتا تھا مدت سے نہیں تراشے گئے ہیں۔ سب سے بُرا حال اس کے پیروں کا تھا۔ وہ جوتوں سے محروم تھا اور اس کے پیر گرد سے اَٹے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور بے حد روشن تھیں۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی احساس ہو گیا کہ وہ بھوکا ہے۔

پھر اس نے نظریں اٹھائیں اور لاجونتی کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد وہ اسے یوں دیکھتا رہا جیسے اس کے چہرے سے نظر اٹھانا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔ لاجونتی کچھ خوف زدہ لگ رہی تھی۔ آخر کار وہ سخت لہجے میں بولی۔ "تمہیں جرأت کیسے ہوئی یہاں گھسنے کی۔ جانتے بھی ہو یہ باغ کس کا ہے؟"

"میں شرمندہ ہوں' بھوک نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔"

نوجوان کی آواز بہت نرم تھی اور لہجہ پُرسکون۔ اسے شاید احساس ہی نہیں تھا کہ اس نے خود کو کیسے خطرے سے دوچار کر لیا ہے۔ بات کرتے ہوئے وہ مسکرایا تھا تو اس کے سفید چمک دار دانت نمایاں ہو گئے تھے۔ مسکراتے ہوئے وہ اور کم عمر لگا۔

لاجونتی نے شک آمیز نگاہوں سے گنگا دھر کو دیکھا۔ پھر وہ نوجوان سے بولی۔ "اگر تم نے مجھ سے پھل مانگ لئے ہوتے تو میں دے دیتی.........." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اُسے احساس ہو گیا کہ اس نے احمقانہ بات کی ہے۔ یہ شخص اسے جانتا تک نہیں۔ ایسے میں وہ اس کے پاس آکر درخواست کرتا کہ مجھے اپنے باغ سے کچھ پھل توڑ کر دے دو! بلکہ یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ اردلی موجود نہیں تھا۔ اردلی موجود ہوتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

بیگاری کی موجودگی لاجونتی کے لئے کچھ کم پریشان کن نہیں تھی کہ وہ اسے ٹکٹکی باندھے بھی دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ سوچ کے.......... بہت کوشش کر کے آخر کار لاجونتی نے کہا۔ "اگر تم بھوکے ہو تو آؤ میرے ساتھ۔"

گنگا دھر نے اس موقع پر مداخلت ضروری سمجھی۔ اُس نے بیگاری سے کہا۔ "تمہیں نہیں معلوم کہ کیمپ کے پہرے دار تمہیں شوٹ بھی کر سکتے ہیں۔"

"میں بھاگ کر نہیں آیا ہوں۔" بیگاری نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ "میں تو بس سڑک پر چلتے چلتے ادھر نکل آیا ہوں۔"

"آپ اسے سمجھائیں۔ اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے کھانا کھلائے بغیر

واپس نہیں جانے دوں گی۔" لاجونتی قیدی کو کھانا کھلانے پر مُصر تھی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" بیگاری نے کہا۔

"تو پھر چلو۔" لاجونتی بولی اور پھر گنگا دھر کی طرف مڑی۔ "آپ بھی آ جائیے پلیز۔"

گنگا دھر ہچکچایا لیکن اس نے مناسب یہی سمجھا کہ لاجونتی کی بات مان لے۔

لاجونتی نے ان دونوں کو برآمدے میں پڑی بینچ پر بٹھایا اور خود گھر میں چلی گئی۔ "تم کہاں کے ہو؟" گنگا دھر نے بیگاری سے پوچھا۔

"میرا تعلق نچھورا سے ہے۔" قیدی نے بتایا۔ "میری ماں کشمیری تھی اور باپ کا تعلق آبو سے تھا۔ میں ترکھان ہوں.......... بلکہ نقاش ہوں۔ اخروٹ کی لکڑی پر نقش و نگار بناتا ہوں' اچھا کاریگر ہوں زندگی گزر رہی تھی کہ اس مصیبت میں پھنس گیا۔"

وہ گفتگو تو اسکول ماسٹر سے کر رہا تھا لیکن اس کی نظریں اس دروازے پر جمی تھیں جس سے گزر کر لاجونتی اندر گئی تھی۔

لاجونتی واپس آئی تو بیگاری نے اپنی گھٹنوں پر سے پھٹی ہوئی شلوار کو چھپانے کے لئے وہ گھٹنا کھڑا کر کے اس پر دوسری ٹانگ رکھ لی۔

لاجونتی نے کھانے کی ٹرے اس کی طرف بڑھائی۔ بیگاری نے ٹرے تھام لی لیکن اس کے ہاتھوں کی لرزش چھپی نہ رہ سکی۔ وہ اپنی بھوک کی شدت بے نقاب ہونے پر اتنا شرمندہ تھا کہ ان کے سامنے بیٹھ کر کھانا اس کے لئے ناممکن تھا۔

لاجونتی نے گنگا دھر کو اور گنگا دھر نے لاجونتی کو دیکھا۔ دونوں کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں طے ہوا کہ بیگاری کو شرمندگی سے بچانے کے لئے وہاں سے ہٹ جانے ہی میں بہتری ہے۔ وہ دونوں وہاں سے ہٹ گئے۔ گنگا دھر نے لاجونتی کو بیگاری کے بارے میں بتایا۔

"اسے پہننے کے لئے بھی کچھ دینا چاہئے۔" لاجونتی نے کہا۔

"بالکل دینا چاہئے۔ آخر وہ بھی کشمیری ہی ہے۔"

"جی ہاں!" لاجونتی بولی۔ "کرتا کیا ہے؟"

"کیا کرتا تھا کہو۔ اب تو بیگاری قیدی ہے۔ اخروٹ کی لکڑی کا کاریگر بھی ہے اور

نقاشی بھی کرتا ہے۔"

"یعنی فنکار ہے۔" لاجونتی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ وہ حیران بھی تھی اور متاثر بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ دوبارہ کاٹیج میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا۔ وہ دونوں بیگاری کے پاس پہنچے تو ٹرے پر شفتالو رکھے نظر آئے۔ کھانے کی تمام چیزیں قیدی نے کھالی تھیں اور توڑے ہوئے شفتالو واپس کر دیئے تھے۔

لاجونتی نے پارسل بیگاری کی طرف بڑھا دیا۔ "پلیز......... یہ رکھ لو۔ اور اگر تم آئندہ بھی آسکو تو تمہاری مدد کر کے مجھے خوشی ہو گی لیکن یہ تم نے اپنے توڑے ہوئے شفتالو جیب سے کیوں نکال دیئے۔ یہ بھی رکھ لو۔"

گنگا دھر کو وہ بیگاری کے ساتھ زیادتی محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا' لاجونتی کو قیدی کو بتا دینا چاہئے کہ وہ دوبارہ یہاں آ کر کتنا بڑا خطرہ مول لے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے بیگاری کو دوبارہ مدعو ہی نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اسے یہ احساس تھا کہ وہ کرنل سے نفرت کرتا ہو گا اور یہ بات لاجونتی کو بھی معلوم ہو گی اس لئے لاجونتی کو بیگاری کو یہ بتانے کی ہمت نہیں ہوئی ہو گی کہ وہ کرنل اجیت کی بیوی ہے۔

اس وقت لاجونتی نے اسکول ماسٹر کو بری طرح چونکا دیا۔ "پھر آنا......... اسی وقت۔" وہ بیگاری سے کہہ رہی تھی۔ "نہ اس سے پہلے' نہ اس کے بعد۔ بس یہی وقت ہے۔ جب میں اکیلی ہوتی ہوں۔"

گنگا دھر دہل گیا۔ وہ تو کھلی دعوت تھی۔

بیگاری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ وہ لاجونتی کی ہر جنبشِ بدن کو بڑی مسرت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" لاجونتی نے کہا۔

بیگاری چند لمحے ہچکچایا۔ پھر بولا۔ "میرا نام سجاد ہے جی۔"

"سجاد" گنگا دھر نے دہرایا۔ اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ بیگاری شرمیلی نگاہوں سے لیکن بہت غور سے لاجونتی کو دیکھ رہا ہے۔ وہ عام نگاہیں نہیں تھیں۔ ایک جوان عورت کے حسن کو سراہنے والی جوان نگاہیں تھیں۔

خود گنگا دھر نے سجاد کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ بے حد خوش بدن آدمی تھا۔ اس کا

چہرہ بیضوی تھا' پیشانی چوڑی تھی۔ ٹھوڑی مضبوط اور خالص مردانہ' اس کے ہاتھ اگرچہ بیگار کی وجہ سے کٹے پھٹے تھے مگر اس کے باوجود وہ ایک فنکار کے ہاتھ تھے۔ انگلیوں کی بناوٹ حساسیت کو ظاہر کر رہی تھی۔

رخصت ہوتے وقت بیگاری نے عجیب جسارت کی۔ اس نے لاجونتی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور دیر تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ لگتا تھا کہ اسے گنگا دھر کی موجودگی کا احساس بھی نہیں۔

لاجونتی اس دوران مسکراتی رہی تھی۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

سجاد کے جانے بعد لاجونتی گنگا دھر کی طرف مڑی۔ "میری ایک بات مانیں گے ماسٹر جی؟"

"حکم کرو دیوی!" گنگا دھر نے کہا۔

"یہ بات کرنل صاحب کو نہ بتایئے گا۔"

"لیکن کیوں؟"

"وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ خاص طور پر کشمیری مسلمانوں سے۔ انہیں پتا چلا کہ میں نے کسی کشمیری ہاتو کی مدد کی ہے تو بہت خفا ہوں گے۔"

گنگا دھر کے کرنل اجیت سے خوش گوار تعلقات ضرور تھے لیکن در حقیقت وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ کرنل کو کوئی بھی پسند نہیں کر سکتا تھا۔ گنگا دھر کو لاجونتی سے ہمدردی تھی جو کرنل کے ساتھ رہنے پر مجبور تھی۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ لاجونتی جوان ہونے کے باوجود ایک بے کیف اور بنجر زندگی گزار رہی ہے۔ "بے فکر رہو دیوی جی" اس نے کہا۔ "میں کرنل صاحب کو نہیں بتاؤں گا۔"

لاجونتی ہوں کر کے رہ گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھایا اور گنگا دھر سے پوچھا۔ "یہ زندگی ہوتی ہے بیگاریوں کی؟"

"اس سے کہیں خراب دیوی جی۔ یہ تو بہت اچھے حال میں تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ مراعات یافتہ ہے۔" گنگا دھر نے جواب دیا۔ "اگر دیکھنا چاہتی ہو تو شام کے وقت خود دیکھ لو۔ بیگاری سامنے والے راستے سے گزر کر کیمپ جاتے ہیں۔"

لاجونتی جیسے کسی دکھ بھری سوچ میں ڈوب گئی۔ گنگا دھر اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "بڑا ظلم ہو رہا ہے کشمیریوں کے ساتھ۔" لاجونتی بڑبڑائی۔ "اپنے وطن میں بغیر کسی قصور کے قیدی۔ اپنے وطن میں ہی بیگاری۔" پھر اس نے بینچ پر رکھی ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ٹرے پر شفتالو جوں کے توں رکھے تھے۔ بیگاری نے انہیں دوبارہ جیب میں نہیں ڈالا تھا۔ "ماسٹرجی لیجئے نا" لاجونتی نے گنگا دھر سے کہا۔ پھر اس نے بینچ پر پڑی کتاب اٹھائی اور کھول کر بیٹھ گئی لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ پڑھ نہیں رہی ہے۔

☆=====☆=====☆

اردلی راگھو داس چھکڑے پر پانی لادے واپس آیا تو شام ہو چکی تھی۔ لاجونتی نے اسے اپنے پاس بلایا اور کہا۔ "سنو' کل ہمارے شہر والے گھر جانا۔ وہاں تمہارے صاحب کے جو بوٹ رکھے ہیں وہ لے آنا۔"

اردلی کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"اور ہاں.......... اس بارے میں کسی کو بھی کچھ نہیں بتانا۔ مجھے وہ بوٹ کسی ضرورت مند کو دینے ہیں۔"

اردلی اسے الجھن بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ تاہم اس نے جواب سر کی اثباتی جنبش سے دے دیا۔

لاجونتی نے کرنل کو کچھ بھی نہیں بتایا لیکن رات کے کھانے کے دوران اس نے گفتگو کا رخ دانستہ طور پر بیگار والے قیدیوں کی طرف کر دیا۔

"بیگار تو کشمیر کے راجا کے زمانے سے لی جا رہی ہے۔" کرنل نے کہا۔

"تب کی بات اور تھی۔ اب تو جمہوریت ہے' کشمیر ہند کے زیر نگیں ہے۔ اب تو یہاں بیگار کا کوئی جواز نہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو' اب یہاں ہندوستان کا راج ہے۔" کرنل کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ "اسی لئے اب صرف مسلمانوں سے بیگار لی جاتی ہے۔"

"غلط تو یہ بھی ہے۔"

عمر کے تفاوت کی وجہ سے کرنل بیوی کا لحاظ بھی کرتا تھا۔ اس نے لاجونتی کے تیور دیکھے تو فوراً مدافعانہ انداز اختیار کیا۔ "بات یہ ہے کہ بیگار تو بس بہانہ ہے۔ یہ جو لوگ

کیمپ میں قید ہیں' سب کے سب تخریب کار ہیں۔ یہ یہاں ہنگامے کر کے کشمیر کو پاکستان میں شامل کرانا چاہتے ہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ اُس طرف ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا ہے۔"

"میں بالکل جاہل تو نہیں ہوں سوامی!" لاجونتی نے بہت میٹھے لہجے میں کہا۔ "مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے اول تو وہاں زیادہ ہندو نہیں ہیں اور جو ہیں ان کے ساتھ بُرا برتاؤ نہیں ہوتا۔ کم از کم اتنا برا تو نہیں ہوتا جتنا یہاں مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔"

کرنل کا تحمل دھرا رہ گیا۔ "تم ان مُسلوں کی حمایت کر رہی ہو اور وہ بھی میرے سامنے۔" اس نے دہاڑ کر کہا۔

لاجونتی کا منہ بن گیا لیکن وہ خاموش ہو گئی۔ جانتی تھی کہ کرنل مسلمانوں سے بے اندازہ نفرت کرتا ہے۔ اس سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کرنل کرسی کے پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ لاجونتی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر کار اس نے کہا۔

"کیا چکر ہے لاجو؟ تم ان بیگاریوں کا جلوس دیکھنے کے لئے باہر گئی تھیں کیا؟"

"کون' میں؟ نہیں تو۔" لاجونتی نے جلدی سے کہا۔

"وہ لوگ ہر شام یہاں سے جانے والے راستے سے گزرتے ہیں لیکن میرا مشورہ ہے کہ تم ان کا نظارہ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" کرنل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہارا بہت دل دُکھے گا.......... اس لئے کہ دیکھنے میں وہ انسان ہی نہیں لگتے۔"

لاجونتی چپ نہ رہ سکی۔ "بھوک کے ستائے ہوئے بدنصیب انسان کہاں سے لگیں گے۔" وہ بولی۔

"ان کے پیٹ بھر دیئے جائیں تو کام نہیں کریں گے۔ تم ان کشمیری ہاتوؤں کو نہیں جانتیں۔ یہ بڑے کاہل اور ڈنڈے کے یار ہوتے ہیں۔"

کرنل کو لاجونتی کی آنکھوں میں برہمی نظر آئی۔ اُس نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔ "آج میری ٹانگ میں بہت زیادہ تکلیف ہے۔" اس نے کہا۔

عام حالات میں لاجونتی کا رویہ ہمدردانہ ہوتا تھا مگر اس روز اس نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے موسم بدلنے والا ہے۔"

کرنل نے گرم پانی طلب کیا۔ کچھ دیر بعد اردلی ایک بڑے تسلے میں گرم پانی لے آیا۔ پانی میں تھوڑا سا نمک ملوا کے کرنل نے اپنے جوتے اتارے اور پیر پانی میں رکھ کر بیٹھ گیا۔ جب بھی اس کے پاؤں میں تکلیف ہوتی وہ اس کا یہی علاج کرتا۔ وہ کرسی پر آرام سے بیٹھ گیا اور پانی میں کبھی پاؤں ڈالنے اور کبھی نکالنے لگا۔ پانی خاصا گرم تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔

لاجونتی ان معمولات سے خوب واقف تھی۔ کرنل جب بھی ٹانگوں میں تکلیف کی شکایت کرتا ایسے میں ذرا دیر بعد اس کا رویہ اس کے لئے محبت آمیز ہو جاتا۔ لاجونتی کے لئے وہ لمحے نسبتاً خوش گوار ہوتے تھے مگر اس رات کرنل کی محبت اسے بہت بری لگی۔ وہ جانتی تھی کہ اب کرنل کہے گا......... لاجو ہم دونوں بڈھے ہو رہے ہیں اور یہ سوچتے سوچتے اسے احساس ہوا کہ کرنل تو بڈھا ہے ہی لیکن وہ اسے بھی وقت سے پہلے بوڑھا کئے دے رہا ہے۔

لاجونتی نے کرنل کا لایا ہوا اخبار اٹھایا اور زیادہ روشنی میں جا بیٹھی۔ روشنی کی وجہ سے دیوار پر پتنگوں کا ہجوم تھا۔ باہر جھینگر اپنا گیت الاپ رہے تھے۔ وہ گیت لاجو کو نامکمل آہوں پر مشتمل لگا۔ ہوا بھوسے، دھوئیں اور اُس قیمے کی مہک سے بوجھل تھی جو اردلی بھون رہا تھا۔ مرغزاروں کی طرف سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بیرکس میں کوئی بگل بجا رہا تھا۔ پھر بندے ماترم کی آواز ابھری۔ وہ بھی خود کار انداز میں ساتھ ساتھ گنگنانے لگی۔ وہ غائب دماغی کی سی کیفیت میں تھی۔

اس نے اپنے ذہن کو مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر کشمیر تنازعہ نہ بنا ہوتا تو کیا ہوتا۔ کشمیر کشمیریوں کا ہوتا تو یہ جنت صرف دیکھنے کی جنت نہ ہوتی اس لئے کہ اس صورت میں کشمیر پر مسلمانوں کی حکومت ہوتی۔ یہاں رواداری ہوتی، امن ہوتا، محبتیں ہوتیں۔ خوش حالی اگر نہ بھی ہوتی تو لوگوں کو وہ طمانیت میسر ہوتی، جو محنت کرنے والوں کو اپنی محنت کے صلے میں روکھی سوکھی ملنے پر بھی حاصل ہوتی ہے۔

اور اب کشمیر کا کیا حال تھا۔ یہاں صرف ہندو مہاجن اور فوجی ہی خوش حال اور عزت دار تھے۔ باقی سب لوگوں کے ساتھ وہ سلوک ہوتا تھا جو جنگ کے بعد مفتوحین سے روا رکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ اور بدتر سلوک کیا جا رہا تھا۔ انہیں تو جیسے غلام

سمجھ لیا گیا تھا لیکن وہ دب کر رہنے والی قوم نہیں تھی۔ مزاحمت تو ابتدا سے ہی ہو رہی تھی۔ ابھی کچھ چنگاریاں ہی تڑپی تھیں تو ہندوستان کے زیر تسلط پورا کشمیر ایک فوجی کیمپ اور عقوبت گاہ بن کر رہ گیا تھا اور وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ مستقبل میں کیسی آگ بھڑکنے والی ہے لیکن اس آگ کا تصور لاجونتی کے لئے خوش آئند تھا۔ وہ آگ پورے کشمیر کو جلا کر خاک کر دیتی لیکن اس کے بعد اس خاک سے ہی نیا جنت نظیر کشمیر اٹھتا۔ تعمیر کے لئے وہاں تخریب ضروری تھی۔

لاجونتی اپنی تباہی کا ذمے دار کشمیر کی اس صورتِ حال کو ہی قرار دیتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کے مجرم بھارت کے غاصب حکمراں ہیں اور عالمی لیڈر اور اقوام متحدہ ہے۔ ان سب نے مل کر اس کی خوشیاں لوٹ لی تھیں اور اسے دکھوں کے جہنم میں دھکیل دیا تھا۔ ورنہ اس کی شادی کسی پُرعزم جوان سے ہوئی ہوتی۔ چاہے وہ تھوڑی سی زمین کا مالک ہوتا لیکن بیگار کی دنیا میں کوئی اپنے عزم کو کہاں قائم کر سکتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ماں باپ نے اسے بڈھے کرنل کے پلے باندھ دیا تھا اور سب اس پر متفق تھے کہ وہ بہت خوش نصیب ہے۔ ایسے بر کہاں کسی کو نصیب ہوتے ہیں۔

اور یہ سب کچھ سوچتے ہوئے بیگاری قیدی کا چہرہ اُس کی نظروں میں سمایا ہوا تھا۔ بے چارہ کیسے باڑھ میں سے جانوروں کی طرح رینگ کر باغ میں گھسا ہو گا۔ صرف اس لئے کہ اسے پیٹ بھرنے کے لئے کچھ پھل درکار تھے اور اس نے کہا تھا، میں شرمندہ ہوں لیکن بھوک نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔ اور لاجونتی کو وہ بڑی بے انصافی معلوم ہوئی تھی۔ ایسی بے انصافی جس نے ایک بہت بڑی اجتماعی، قومی اور معاشرتی بے انصافی کے بطن سے جنم لیا تھا۔ وہ اجتماعی بے انصافی کشمیر کو جبر و استبداد کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھنا تھا۔ کشمیر آزاد ہوتا تو لوگ بیگار جھیلنے کی بجائے اپنے لئے محنت کرتے اور رُوکھی سوکھی میں بھی خوش ہوتے۔ خوش حالی کی طرف سست مگر مسلسل پیش قدمی کرتے۔

لاجونتی کا جسم غصے سے لرزنے لگا۔ اس نے سوچا اس اجتماعی بے انصافی کے نتیجے میں زیادتی اور بے انصافی تو میرے ساتھ بھی ہوئی ہے۔ مجھ سے لیا تو بہت کچھ جاتا رہا ہے لیکن دیا کچھ نہیں گیا۔

اسے اپنے بڈھے شوہر پر غصہ آنے لگا۔ اس کی زندگی کی تباہی کا وہی ذمے دار تھا۔

اس کے نزدیک وہ اس کی جوانی کا قاتل تھا۔ وہ اس کے نزدیک خود ایک بہت بڑی بے انصافی اور استحصال کی علامت تھا۔ وہ اپنے اندر جانتی تھی کہ اس جرم پر اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔

اس پر کرنل سے نفرت کے دورے پہلے بھی پڑتے تھے لیکن اس سے پہلے اسے اپنی سوچوں کو بے لگام چھوڑنے کی ہمت کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن اس بار اس نے خود کو ان سوچوں کے دھارے پر بہنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا تھا اور وہ دھارا اسے اتنا دور لے گیا کہ اسے اپنی جرأت پر حیرت ہونے لگی۔ کرنل نے دونوں پاؤں نمک ملے پانی کے تسلے سے نکالے اور اس کے کناروں پر رکھ لئے۔ پھر وہ آرام سے پھیل کر بیٹھ گیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اُس کا سر ایک طرف جھکا ہوا تھا جیسے وہ کچھ سن رہا ہو۔

"لاجو!" اس نے غیر متوقع طور پر کہا۔ "کچھ سنائی دیا ہے تمہیں؟"

"کیا؟"

"گولیوں کی آوازیں۔"

لاجونتی نے بھی کانوں پر زور دیا۔ جنوب کی سمت سے بہت دور سے فائرنگ کی بہت دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بغیر سماعت پر زور دیئے وہ آواز سنائی دے بھی نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ رات بے حد پُرسکوت تھی۔

"ہاں.......... سنائی دے رہی ہیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔

"یہ کشمیری مُسلے چھاپا مار جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔" کرنل کے لہجے میں نفرت تھی۔ "مجھے تو صورتِ حال اچھی معلوم نہیں ہوتی لیکن ہائی کمان بے فکر بیٹھی ہے۔"

"بہت بڑی حماقت ہے یہ۔" لاجونتی بولی۔

کرنل کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ لاجونتی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اتنا متفکر اس نے اسے کم ہی دیکھا تھا۔ ضرور کوئی بری خبر سنی ہو گی اس نے، اس نے سوچا۔

اس رات بستر پر لیٹنے کے بعد وہ کم از کم ایک گھنٹے تک پہلو بدلتی اور سوچتی رہی۔ وہ کشمیر کے مسئلے کے بارے میں سوچ رہی تھی جسے کوئی بھی حل کرنا نہیں چاہتا سوائے نہتے کشمیریوں کے۔ اور وہ اس کے ناگزیر انجام کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ بدقسمت

اور ناخوش بیگاری کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اس کی صورت اس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ وہ بڑی بڑی چمک دار آنکھیں، وہ سیاہ بال، وہ آواز۔ وہ اس کی آواز سننا چاہتی تھی اس نے سوچا کہ اردلی کرنل کے بوٹ لے آیا تو وہ سجاد کو وہ بوٹ دے دے گی۔ اُسے ننگے پاؤں نہیں رہنے دے گی۔

☆=====☆=====☆

لیکن اگلے روز وہ نہیں آیا۔

لاجونتی یونہی ٹہلتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور اس نے اس راستے پر نظر رکھی تھی، جس پر سے گزر کر بیگاری قیدی کیمپ واپس جاتے تھے۔ قیدی گزر گئے لیکن سجاد اُن میں موجود نہیں تھا۔ وہ مایوس اپنے کاٹیج میں واپس آ گئی۔ اسے اپنے اندر عجیب سا خلا محسوس ہو رہا تھا۔ اسکول ماسٹر کے بیوی بچوں سے اس کے اچھے روابط تھے۔ وہ اسکول ماسٹر کے گھر چلی گئی اور کرنل کی واپسی تک وہیں رہی۔ بعد میں کرنل نے اردلی کو بھیج کر اسے بلوایا۔

اسکول ماسٹر نے اسے جو خبر سنائی، وہ بہت پریشان کن تھی۔ "کشمیر کے لڑکوں نے اپنی سرگرمیاں تیز کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" گنگا دھر نے اسے بتایا۔ "وہ گوریلا طرز کی جنگ چھیڑنے کے موڈ میں ہیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" لاجونتی نے پوچھا۔

گنگا دھر مسکرا دیا۔ "کئی وجوہات ہیں مجھے معلوم ہونے کی۔" اس نے کہا۔ "ایک تو میں اسکول ماسٹر ہوں۔ دوسرے اسکول میں مسلمان بچوں کی اکثریت ہے۔ تیسرے میری ہمدردیاں کشمیریوں کے ساتھ ہیں وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اور چوتھی بات یہ کہ لڑکے یہ بات جانتے ہیں کہ میں اُن کا یا مسلمانوں کا دشمن نہیں ہوں۔"

"گوریلا طرز کی لڑائی تو وہ عرصے سے کر رہے ہیں۔"

"خبروں کی شدت بتاتی ہے کہ اب یہ لڑائی شدت اختیار کرے گی۔"

"اس سے ہو گا کیا؟" لاجونتی کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"یہ ہو گا کہ کارروائیاں بڑھیں گی تو بھارت سرکار پاکستان پر مداخلت کا الزام عائد کرے گی اور اسے بہانہ بنا کر بھاری تعداد میں اپنی فوج یہاں بھیج دے گی۔ اس کا جو نتیجہ نکلے گا، تم سمجھ سکتی ہو۔"

لاجونتی خوب سمجھتی تھی کہ اس صورت میں کیا ہو گا۔ موجودہ صورت حال ہی کچھ کم خراب نہیں تھی۔ چند روز پہلے مسلمان لڑاکوں نے سری نگر کے باہر تین فوجیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ ردِ عمل کے طور پر بھارتی فوجیوں نے مسلمان دیہاتیوں کو اچھی خاصی تعداد میں گرفتار کر لیا تھا۔ ان پر بے پناہ تشدد کیا گیا تھا۔ بعد میں کچھ کو گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ بیشتر لوگ ابھی تک بھارتی فوج کی قید میں تھے۔ اس کے نتیجے میں بھارتی فوج کے خلاف نفرت پھیل رہی تھی۔ لوگ بُری طرح غیر مطمئن تھے ہر طرف بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ عدم تحفظ کا شکار تھے۔ لگتا تھا کہ اندر ہی اندر لاوا پک رہا ہے‘ کسی بھی وقت آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔

ہمیشہ کی طرح کرنل اور لاجونتی نے رات کا کھانا برآمدے میں کھایا۔ کرنل فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اسٹور میں چوری ہو گئی۔ اس کے علاوہ بیرکس میں دو فوجی ہیضے کا شکار ہو گئے یعنی وبا بیرکس میں گھس آئی ہے۔

رات اندھیری تھی‘ باہر آوارہ کتے بھونک رہے تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ پھر پہاڑ کے پیچھے سے نارنجی رنگ کے چاند نے سر اٹھایا اور جیسے سماں بدل گیا۔

اگلی دوپہر کرنل کھانے کے لئے آیا تو بے حد متوحش تھا۔ اسے بھوک بھی نہیں تھی۔ بس وہ عادتاً چلا آیا تھا۔ "جانتی ہو‘ آج کیا ہوا۔" اس نے کہا۔ "ہمارا ایک روسی ساخت کا جیٹ طیارہ گرا دیا گیا۔"

"راستہ بھٹک کر پاکستانی حدود میں چلا گیا ہو گا۔" لاجونتی نے بے پروائی سے کہا۔

"نہیں۔ اس پر اپنے علاقے میں ہی فائر کیا گیا تھا۔" کرنل جھنجلا گیا۔

"کس نے گرایا ہو گا؟"

"مُسلوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔"

"کشمیری؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاز گرانا کوئی مذاق ہے۔ یہ رائفل کے بس کا کام تو نہیں۔ یہ پاکستانیوں کی حرکت ہے۔"

لاجونتی کو اسکول ماسٹر گنگا دھر کی بات یاد آ گئی۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ بس سوچتی رہی کہ صورتِ حال خرابی کی طرف بڑھ رہی ہے۔

کرنل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کشمیری مُسلوں کی حرکت ہو۔" آخر کار وہ بولا۔ "لیکن یہ اور خراب بات ہے۔"

"وہ کیسے؟" لاجونتی نے حیرت سے پوچھا۔ "کشمیریوں کو کچلنا زیادہ آسان ہے تمہارے لئے۔" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"اگر یہ کشمیریوں کی حرکت ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں جدید اسلحہ مل رہا ہے۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر کرنل نے کہا۔ "عملے میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔"

کرنل کے جانے کے بعد لاجونتی کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ مگر اس سے کچھ پڑھا نہیں گیا۔ اس کے تصور میں بیگاری سجاد کا چہرہ پھرتا رہا۔

آنے والے ہر دن میں اسے کوئی نہ کوئی خبر ملتی رہی۔ کبھی کوئی خبر کرنل سناتا اور کبھی گنگا دھر۔ دونوں کی خبروں کا تاثر مختلف ہوتا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ دونوں کی ہمدردیاں مختلف فریقوں کے ساتھ تھیں۔ خبر گرم تھی کہ کشمیری لڑاکے ایک بے حد طاقت ور تنظیم کے روپ میں ابھر رہے ہیں اور کسی بھی وقت جنگ چھڑ سکتی ہے۔

"ہماری انٹیلی جنس سر توڑ کوشش کر رہی ہے کہ اس تنظیم کے متعلق مکمل معلومات حاصل ہو جائیں۔ اس کے ایک بے حد خطرناک اور فعال رکن کے متعلق کچھ معلوم ہوا ہے۔ اس کا نام معراج میر ہے۔ تربیت یافتہ لڑاکا ہے لیکن اس سے آگے کچھ معلوم نہیں وہ کون ہے‘ کہاں رہتا ہے‘ کیا کرتا ہے‘ کیسا ہے؟ اس بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

"تب تو وہ اور خطرناک ہوا۔" لاجونتی کو یہ کہتے ہوئے عجیب سی خوشی کا احساس ہونے لگا۔

"ہاں لیکن بچ کر کہاں جائے گا۔ ہماری انٹیلی جنس بہت تندہی سے کام کر رہی ہے۔"

"تب تو بیگار کیمپ بھر گئے ہوں گے۔" لاجونتی نے طنز کیا۔

لیکن اُس کی بات کرنل کے سر پر سے گزر گئی۔ "کیمپ تو بھر گئے ہیں لیکن بیگاری قیدی بھی تو ایک بوجھ ہی ہیں۔"

"کیسا بوجھ؟ انہیں بھوکا مارتے رہتے ہو تم۔ کام الگ ڈنگروں کی طرح لیتے ہو۔ یہ تو آم کے آم' گٹھلیوں کے دام والا معاملہ ہے۔"

کرنل چڑ گیا لیکن اُس نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

☆=====☆=====☆

ایک ہفتہ گزر گیا لیکن سجاد پلٹ کر نہیں آیا۔ راگھو داس شہر سے کرنل کے پرانے بوٹ لے آیا تھا۔ لاجونتی کو مجبوراً انہیں چھپا کر رکھنا پڑا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان پر کرنل کی نظر پڑے اور وہ اس سلسلے میں پوچھ گچھ کرے۔ ہر شام وہ اسکول ماسٹر گنگا دھر کے گھر جاتی۔ وہ اس راستے سے گزرتی جس سے گزر کر بیگاری اپنے کیمپ واپس جاتے تھے۔ ایسے میں اسے ہروقت سجاد کا خیال آتا۔ اس کی صورت دیکھنے کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔

دو ایک بار اس نے بیگاری قیدیوں کو گزرتے دیکھا۔ بڑی لمبی قطار تھی لیکن ان میں سجاد موجود نہیں تھا۔ ایک بار وہ اسکول ماسٹر کی بیوی کُسم کے ساتھ باسکٹ میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں لے کر گئی لیکن بھوکے قیدیوں نے ایک ایک روٹی کے حصول کے لئے جس وحشیانہ انداز میں ایک دوسرے کو نوچا کھسوٹا' اس نے لاجونتی کو شرمندہ کر دیا۔ پہلی بار اُس کی سمجھ میں آیا کہ بھوک اور تہذیب کے درمیان سوتن والا رشتہ ہے اور پورے ملک کی بھوک کوئی نہیں مٹا سکتا.......... بھوکا مارنے والوں کے سوا۔

وہ واپس آئی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جسم میں لرزہ۔ اس دن کے بعد وہ کبھی اس راستے کے قریب بھی نہیں پھٹکی' اس نے امید بھی چھوڑ دی کہ کبھی سجاد اس کے گھر آئے گا اور وہ اسے اپنے پتی کے بوٹ دے سکے گی۔

وہ ہفتہ ختم ہوا تو گرم خشک ہوا چلنے لگی۔ لگتا تھا وہ ہوا کسی صحرا کی طرف سے آئی ہے اس لئے کہ وہ اپنے ساتھ بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں لائی تھی۔ راستوں پر گرد کے بگولے اٹھ اٹھ کر درختوں سے لپٹنے لگے۔ درختوں کے پتے بین کرتے محسوس ہوتے تھے۔ آسمان مٹیالا ہو گیا اور دھوپ اور اذیت ناک ہو گئی۔ برآمدے میں شاہ بلوط کی پتیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ دن بھر ہوا ان پتیوں میں چھپ کر آہیں بھرتی۔

لاجونتی پر ایک ایسی اداسی اور سوگواری طاری ہو گئی' جسے وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتی

تھی۔ اس کا سر ہروقت دُکھتا اور اعصاب کشیدہ رہتے۔ اندر سے بس ایک آواز آتی۔ کچھ ہونے والا ہے' ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ راتوں کو اُسے چاندنی سے نفرت محسوس ہوتی۔ دن میں نہ رکنے والی گرم ہوا کے جھکڑ اُسے ڈپریشن میں مبتلا کر دیتے۔

اس سہ پہر وہ اکیلی تھی!

اردلی راگھو داس پانی لانے کے لئے جا چکا تھا۔ وہ نیم تاریک کاٹیج میں بیٹھی گلیورز ٹریولز پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بندھی ہوئی چلمن اوپر کو اُڑی تو کتاب کے صفحے پر روشنی سی لہرائی۔ اس نے چونک کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو ہوا نے کتاب کے صفحے پلٹ دیئے وہ جھنجلا گئی۔

اچانک اسے ایک مختلف آواز سنائی دی۔ اس نے سر اٹھا کر غور سے سننے کی کوشش کی۔ چلمن کے بار بار ٹکرانے اور ہوا کے شور کے باوجود اُسے باہر سے قدموں کی واضح چاپ سنائی دی۔ قدموں میں ہچکچاہٹ تھی۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔ اس نے چادر الٹ دی اور بستر پر سنبھل کر بیٹھ گئی۔ قدموں کی آہٹ قریب آتی گئی۔ اس نے گھبرا کر پاؤں بیڈ سے لٹکائے اور سلیپرز میں پاؤں ڈالنے لگی۔

روشن دروازے کے سامنے ایک پرچھائیں نظر آئی اور پھر وہ بیگاری قیدی نظر آیا جس کا انتظار کر کے وہ ہار چکی تھی۔

سجاد نے سر کو جنبش دی اور کچھ کہا لیکن لاجونتی اس کی اس قدر غیر متوقع آمد پر یوں ششدر ہوئی تھی کہ گنگ ہو کر رہ گئی۔ اس نے یہ بھی نہ سنا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے سینے کی طرف گیا۔

اور جیسے اچانک وہ آیا تھا' ویسے ہی رخصت.......... بلکہ غائب ہو گیا۔

لاجونتی جانے کتنی دیر سینے پر ہاتھ رکھے ساکت و جامد کھڑی رہی۔ اُس کی سانسیں اور دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ اسے ایسا لگ تھا' جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھا ہو۔ اب وہ سماعت پر زور دے رہی تھی کیونکہ قدموں کی آہٹ ہی اس امر کی تصدیق کر سکتی تھی کہ سجاد واقعی آیا تھا اور یہ کہ وہ سجاد ہی تھا' اس کا بھوت نہیں۔

اس نے دروازے سے نظریں ہٹائے بغیر ہاتھ بڑھا کر بیڈ سے چادر اٹھائی اور اسے بدن پر لپیٹ کر باہر برآمدے کی طرف لپکی۔ یہ خیال اس کی دل شکنی کر رہا تھا کہ وہ باہر

موجود نہیں ہو گا لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ باہر برآمدے میں بینچ کے پاس کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی بینچ کے پاس جس پر بیٹھ کر اُس نے اُس روز کھانا کھایا تھا۔

اُسی وقت اسے احساس ہوا کہ ہوا تھم گئی ہے۔ فضا پر عجیب سی گھٹن مسلط ہو گئی تھی۔ اس نے باہر دیکھا' دھوپ غائب ہو چکی تھی اور آسمان کو کالی گھٹا نے چھپا لیا تھا۔ ہوا یوں ٹھہری تھی کہ درختوں پر پتے بھی ساکت تھے۔ پورے ماحول پر سکوت طاری تھا۔

اس کے ذہن کا بھی عجیب حال تھا۔ وہاں صرف ایک واضح خیال تھا۔ یہ کہ وہ ایک اجنبی کے ساتھ وہاں اکیلی ہے۔

وہ یوں اُس کی طرف بڑھی' جیسے سوتے میں چل رہی ہو۔ اس کے علاوہ کچھ کرنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔ قریب پہنچ کر اُس نے زیرِ لب کچھ کہا اور شرمیلے پن سے مسکرائی۔ پھر اس نے غیر متوقع طور پر اپنا نرم و نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے وہ ہاتھ تھام لیا۔

"میرا خیال تھا' تم.........." وہ 'مجھے' کہتے کہتے رک گئی۔ "بھول گئے ہو گے۔" اس نے جملے کا پورا تاثر تبدیل کر دیا۔

"میں تو آنا چاہتا تھا۔" وہ بولا۔ "لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔"

"ہم راستے پر جانے والے قیدیوں میں تمہیں تلاش کرتے رہے تھے۔" لاجونتی نے کہا۔ "میں اور ماسٹر جی کی بیوی۔" اس نے وضاحت کی۔ پھر پوچھا۔ "کیا تم دوسرے قیدیوں کے ساتھ کیمپ واپس نہیں جاتے؟"

"میں کیمپ میں کام کرتا ہوں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

وہ کچھ دیر ایک دوسرے کے روبرو خاموش کھڑے رہے۔ اچانک لاجونتی کی چادر کندھوں پر سے پھسل گئی۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ سجاد کی چمکیلی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی تھیں اور وہ سحرزدہ سی اُس کی آنکھوں میں دیکھے جا رہی تھی۔

اچانک لاجونتی کے وجود میں ایک احتجاج ابھرا اور پھر شرم و حیا۔ اسے پھر یہ خیال آیا کہ وہ اس شخص کے ساتھ اکیلی ہے اور یہ شخص اس کے لئے ایک اجنبی ہے.......... غیر ہے۔ اس نے بڑی کوشش کر کے خود سنبھالا۔ اس کے اندر.......... بہت اندر جو جذبہ ابھر رہا تھا' اسے اس جذبے سے لڑنا تھا۔ اسے اپنے آپ پر شرم آ رہی تھی۔

"تم یہیں رکو۔ میں ابھی آئی۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا یہ کہہ کر وہ کاٹیج میں چلی گئی۔ کاٹیج کے حفاظت کدے میں اُس نے خود سے کہا۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں؟ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ پاگل ہو گئی ہوں میں؟ بس مجھے بوٹ دے کر اسے رخصت کر دینا چاہئے۔

اس کے باطنی وقار نے فوراً ابھر کر اسے سہارا دیا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور بڑے باوقار انداز میں' چھپائے ہوئے بوٹ نکالے۔ اس کے چہرے پر سکوت تھا بلکہ سختی کا تاثر تھا۔ بوٹ لے کر وہ باہر نکل آئی۔

"یہ بوٹ رکھ لو۔" اس نے خشک لہجے میں کہا اور بوٹ سجاد کی طرف بڑھا دیئے۔

اس نے دیکھ لیا کہ وہ حیران ہوا ہے۔ جوتوں کی پیشکش سے بھی اور اس کے انداز کی تبدیلی سے بھی۔ بہرحال اس نے ہاتھ بڑھا کر بوٹ لے لئے اور اس کی نظریں جھکیں۔ وہ اپنے کٹے پھٹے پیروں کو دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت لاجونتی کو احساس ہوا کہ وہ پہلے سے بہتر کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ پیوند لگی شلوار کی جگہ ایک پرانی جینز نے لے لی تھی۔ قمیض بھی پرانی تھی لیکن پچھلی بار والی قمیض جیسی بوسیدہ نہیں تھی۔

"شکریہ جی.......... آپ کی بڑی مہربانی۔" سجاد نے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ یہ تمہارے ٹھیک آئیں گے۔" لاجونتی نے جلدی سے کہا۔ "یہ میرے پتی کے جوتے ہیں۔ اب وہ انہیں نہیں پہنتے۔"

"آپ کے پتی کہاں ہیں؟"

"شہر گئے ہیں' وہ ایک سرکاری افسر ہیں۔"

سجاد نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ لاجونتی کو اندازہ ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ "اور آپ کے بچے؟"

"میرے بچے نہیں ہیں۔" لاجونتی نے اداس لہجے میں کہا۔

وہ تسموں سے تھام کر جوتوں کو جھلا رہا تھا۔ اس کی چمکیلی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ "میں آپ کے پتی کو جانتا ہوں۔" اس نے اچانک کہا۔ "وہ یہاں کیمپ کمانڈنٹ ہیں۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"میں نے کیمپ میں پوچھا تھا۔ آپ نے یہ بات چھپائی کیوں؟"

لاجونتی الجھنے لگی، ہچکچانے لگی۔ "وہ.......... وہ قیدیوں کے.......... بیگاریوں کے ساتھ بہت سختی کرتے ہیں نا اس لئے.........."

"اور آپ بہت مہربان ہیں۔"

"تمہیں محتاط رہنا چاہئے۔" لاجونتی بولی۔ "میں یہاں ہر وقت اکیلی نہیں ہوتی۔"

"مجھے معلوم ہے۔ ایک اردلی آپ کے پاس ہوتا ہے اور ایک خادمہ.........."

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے دیکھا ہے انہیں۔"

لاجونتی بلند آواز میں ہنس دی۔ مدت سے وہ اس طرح نہیں ہنسی تھی۔

"جس دن آپ نے مجھے پکڑا تھا' میں اُس کے تیسرے دن پھر آیا تھا۔" سجاد نے بدمزگی سے کہا۔ "لیکن آپ اکیلی نہیں تھیں۔ اردلی یہاں بینچ پر بیٹھا تھا۔ وہ کوئی لکڑی چھیل رہا تھا۔"

"تم خطرات بہت مول لیتے ہو۔" لاجونتی نے کہا۔ اب وہ اس اجنبی کو اجنبی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ "کچھ کھاؤ گے؟"

"آپ بہت مہربان ہیں۔ میں انکار تو نہیں کر سکتا۔"

لاجونتی بھاگتی ہوئی کاٹیج میں چلی گئی۔ خوف اور شرم.......... اب وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ اس نے دو روٹیاں' کچھ مکھن اور ساگ رکھ کر اخبار میں لپیٹیں اور جلدی سے باہر آئی۔ اردلی کی واپسی کا وقت ہو رہا تھا۔ اب مناسب یہی تھی کہ وہ بیگاری کو جلد از جلد رخصت کر دے۔

وہ باہر آئی۔ بیگاری وہیں کھڑا تھا۔ اس نے اخبار میں لپٹی روٹیاں اُس کی طرف بڑھا دیں۔ "یہ لو۔ اردلی بس اب واپس ہی آنے والا ہو گا۔"

"اچھاجی' میں چلتا ہوں۔"

وہ گیٹ کی طرف نہیں گیا بلکہ باغ کی طرف جانے والے راستے پر بڑھ لیا۔ لاجونتی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ کر وہ پلٹا اور لاجونتی کو دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلانے لگا۔ لاجونتی نے بھی جواباً ہاتھ لہرایا پھر وہ جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

لاجونتی کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اُس نے اندر جا کر پلاس نکالا' باہر کی گھنٹی کا سوئچ

آف کیا اور خود بھی جھنڈ کی طرف چل دی۔ جھنڈ سے گزر کر وہ خاردار تاروں کی باڑھ تک پہنچی۔ اس نے تاروں کو موڑ کر اتنی جگہ بنا دی کہ اس میں سے ایک آدمی بہ آسانی اس طرح گزر سکتا تھا کہ اس کا جسم تاروں سے مس نہ ہو اور گھنٹی نہ بجے۔ اُس نے پہلے خود پر تجربہ کیا اور اُس جگہ سے باہر نکلی اور فوراً ہی اندر واپس آئی۔

مڑے ہوئے تاروں کے سامنے کھڑے ہو کر اُس نے طمانیت سے سر ہلایا۔ وہ مطمئن تھی کہ اب سجاد اس راستے سے بغیر کسی دشواری کے اندر آ سکتا ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ سجاد اس سے خاصا بھاری ہے۔ یہ سوچتے سوچتے نہ جانے کیوں اسے حیا آ گئی مگر وہ مطمئن تھی کہ سجاد کو کوئی دشواری نہیں ہو گی۔

اچانک ہی اسے تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ ساتھ ہی وہ اداس ہو گئی۔ وہ درخت کے جھنڈ سے گزر کر باہر آئی اور برآمدے کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ اسکول ماسٹر گنگا دھر تھا۔

وہ کاٹیج میں داخل ہوئی' اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر لیٹ گئی۔ اس وقت اس کی عجیب کیفیت تھی۔ جیسے وہ کسی ٹرانس میں ہو۔ اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ نہ کوئی سوچ نہ کوئی خیال۔ بس کوئی عجیب چیز تھی جو اسے رہ رہ کر اپنے بدن کے وجود کا احساس دلا رہی تھی اور اس احساس کے ساتھ ایک دُکھن بھی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں تو ایک یاد بھی چپکے سے اس کی آنکھوں میں در آئی۔ اس لمحے کی یاد جب چادر اس کے کندھوں سے ڈھلکی تھی تو سجاد نے اسے کس طرح دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ سجاد کی ان نظروں نے ہی اسے اپنے بدن کے وجود کا احساس دلایا تھا' جس کا اسے اب پتا چل رہا تھا۔

ہے بھگوان' اب اسے ادھر نہ بھیجنا۔ اس نے گھبرا کر سوچا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے وہ طلسم ٹوٹ گیا۔ ایک خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا لیکن وہ اس خیال سے خوش بھی تھی۔ سجاد جانتا تھا کہ وہ کیمپ کمانڈنٹ کی بیوی ہے۔ اس کے باوجود اس نے دوبارہ اس تک پہنچنے کی جرأت کی تھی۔ کیوں؟

یہ اچھا بھی ہوا۔ بہت اچھا ہوا' وہ بڑبڑائی۔ میں تو کبھی اسے یہ بتانے کی ہمت نہ کرتی لیکن یہی بہتر تھا کہ اسے معلوم ہو۔

کمرے میں اندھیرے کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ گھٹا اور گہری ہو گئی تھی۔ اسی لمحے بادل گرجے، بجلی چمکی اور پھر اچانک ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ وہ بارش کو ترسی ہوئی دھرتی کی طرح بے تاب ہو کر بارش کی طرف لپکی۔ اگلے ہی لمحے وہ بچوں کی طرح بارش میں کھڑی بھیگ رہی تھی۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کے ہونٹوں پر کیسی خوب صورت مسکراہٹ چمک رہی ہے۔

جلتی تپتی زمین پر بارش گری تو اپنے بدن کا احساس اور شدید ہو گیا۔ اس کے اندر کی کیفیت ایک دم بدل کر رہ گئی۔ وجود میں چھپی بے شمار خواہشیں مچلنے لگیں۔ رگوں میں مچلتے بہتے خون میں عجیب سا کیف شامل ہو گیا۔ اس کے ذہن میں نہ کوئی نام تھا نہ چہرہ، بس ایک لفظ محبت کی تکرار ہو رہی تھی۔ زمین تو صرف ایک سال سے بارش کو ترسی ہوئی تھی جبکہ وہ تو جنم جنم کی پیاسی تھی محبت کی۔

اس کے کپڑے بھیگ کر جسم سے چپک گئے۔ پھر اس کے ذہن سے ہر فکر، ہر خوف، ہر احتیاط مٹ گئی۔ اس نے سوچا ہر علامت تو واضح ہے۔ آج وہ آیا تو اتنے مہینوں کا حبس ٹوٹا۔ یہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں پہلی بارش ہے اور یہ میرے پریتم کی آمد کا کرشمہ ہے۔ ہے بھگوان۔ ایسا سکون مجھے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

اس نے باغ کی سمت دیکھا۔ درخت بارش میں جھوم رہے تھے۔ پھول نکھر گئے تھے۔ ہر چیز پر ایک وجد سا طاری تھا۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی تھی۔ بس تپتی ہوئی زمین پر پانی پڑا تھا تو گرم بھبکے اٹھ رہے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ ذرا دیر بعد اس مٹی سے سوندھی سوندھی مہک اٹھے گی اور خوشی کی تکمیل ہو جائے گی۔

وہ صرف بارش کا کمال تھا اور پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ محبت بارش ہی تو ہے۔

کچھ دیر بعد اسے ٹھنڈ لگنے لگی۔ اس نے اندر جا کر لباس تبدیل کیا اور برآمدے میں آ بیٹھی۔ بارش اب بھی اسی شدت سے ہو رہی تھی۔ باہر سے بچوں کی مسرت بھری چیخیں سنائی دے رہی تھی جو بارش میں نہا رہے تھے۔ مٹی سے گرم بھبکے اٹھنے بند ہو گئے تھے۔

وہ وہاں بارش کے طلسم میں اسیر بیٹھی سوچتی رہی۔ اسے اپنی سوچوں پر اختیار نہیں

تھا۔ کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ سوچ رہی تھی وہ جانتی تھی کہ سجاد آئندہ بھی اس کے پاس آئے گا۔ وہ ضرور آئے گا۔ کیمپ کمانڈنٹ کرنل اجیت کا خوف بھی اُسے نہیں روک سکے گا۔ اس کا وجود سرشار جذبوں سے بھر گیا۔

بیل گاڑی کی آمد نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر اردلی کو دیکھا۔ وہ مداخلت اسے بہت بری لگی تھی۔ "کیا ہے؟" اس نے چڑچڑے پن سے پوچھا۔

"اندر کے لئے تازہ پانی چاہئے بیگم جی؟" اردلی نے پوچھا۔ بارش نے اسے شرابور کر دیا تھا۔

ایک لمحے کو لاجونتی کو ایسا لگا کہ راگھو داس سجاد کے بارے میں جانتا ہے۔ ورنہ وہ اسے اتنی شک آمیز نظروں سے کیوں دیکھتا اور اسے کرنل کے بوٹ بھی یاد ہیں۔ وہ سمجھ گیا ہو گا کہ اس نے وہ بوٹ اپنے.......... پھر اس نے سوچا۔ یہ میرا وہم ہے۔

"ہاں.......... اندر بھی پانی چاہئے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

راگھو داس گاڑی پر لدے ہوئے پانی کے برتن اتارنے لگا۔ لاجونتی اندر چلی گئی۔ راگھو داس کاٹیج میں نہیں جا سکتا تھا۔ اندر پانی اسے خود لے جانا تھا۔

اس نے اندر کے مٹکوں اور چھوٹی ٹنکی میں پانی بھر لیا۔ راگھو داس نے بیلوں کو کھول دیا تھا اور ان کے آگے چارا ڈال رہا تھا۔

لاجونتی کے ذہن میں پھر وہی خیال ابھرا کہ شاید راگھو داس نے سجاد کو دیکھ لیا ہے۔ مگر پھر اس نے سوچا.......... دیکھ بھی لیا ہے تو وہ یہ بات کرنل کے سامنے کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ اس کے باوجود اس شخص کی نظروں کے سامنے رہنے کا تصور اسے اچھا نہیں لگے گا، جو اس کی دانست میں اس کے راز سے واقف ہو گیا تھا۔ اس سے بہتر اس نے یہ سمجھا کہ اسکول ماسٹر کے گھر چلی جائے۔ وہاں یقیناً جھولے پڑے ہوں گے اور پکوان تیار کئے جا رہے ہوں گے۔

پہلی بار اُس کے اندر جینے کی امنگ اور سچی خوشیوں کی ترنگ ابھر رہی تھی۔

☆=====☆=====☆

اگلے روز بارش رک چکی تھی لیکن زمین بہت پُرسکون معلوم ہو رہی تھی۔ ہوا نے اپنی جھلسا دینے والی روش ترک کر دی تھی اور اب اپنے اندر خنکی اور خوش گواری لئے

سج سج چل رہی تھی۔ درختوں سے پتے جھڑنے لگے تھے۔ باہر دیکھ کر لگتا تھا کہ خزاں وقت سے پہلے دبے قدموں چلی آ رہی ہے۔ ہر طرف ایک عجیب سا مسرت آمیز سکوت طاری تھا۔ شفاف ہوا کی وجہ سے اردگرد کی پہاڑیاں بہت نزدیک محسوس ہو رہی تھیں۔ پہاڑیوں پر بنے ہوئے مکانات دھلے دھلے اور بے حد سفید لگ رہے تھے۔ اندر کاٹیج کے برآمدے میں بھی پہلے جیسی گھٹن نہیں تھی۔ زرد پتوں نے باغ کی طرف جانے والی پگڈنڈی کو ڈھانپ دیا تھا۔

لاجونتی نے اردلی سے کہہ کر اپنی سلائی کی مشین برآمدے میں منگوا لی تھی۔ وہ اپنے پرانے کپڑوں کو کاٹ پیٹ کر جمنا کی آنے والی نواسی یا نواسے کے لئے فراکیں سی رہی تھی۔ فضا میں مشین چلنے کی آواز گنگناہٹ سے مشابہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ مشین چلاتے ہوئے کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ وہ گیت اس نے اپنی ماں کو گنگناتے سنا تھا۔ شاید ماں بھی اسے سلائی کرتے وقت ہی گنگناتی تھی یا لاجونتی نے اسے سلائی کے دوران ہی گاتے سنا ہو گا۔

وہ بچپن کی بات تھی اور بچپن کی یادیں لاجونتی کو ہمیشہ سوگوار کر دیتی تھیں۔

جمنا لاجونتی کے پاس ہی زمین پر بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر زمانے کی سختی نے قبل از وقت ہی جھریاں ڈال دی تھیں۔ چادر کے نیچے سے اس کے سفید بال جھانک رہے تھے۔ وہ بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے لاجونتی نے فیصلہ کیا کہ آج اپنی ایک پرانی ساری اور بلاؤز اسے ضرور دے گی۔

جمنا کے جانے کا وقت نکل چکا تھا۔ اس روز وہ اپنے معمول سے زیادہ ٹھہری تھی۔ گھر کا کام وہ ختم کر چکی تھی' اس وقت اس کے چہرے پر بڑی طمانیت تھی۔ اس کے سامنے قینچی رکھی تھی اور وہ لاجونتی کے ایک پرانے بلاؤز کے ٹانکے کھول رہی تھی۔ وہ خوش تھی۔ اس کی بیٹی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا اور نیک دل مالکن نے اس کی بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔ غربت ہو تو نومولود بچے کا تن ڈھانپنا بھی مسئلہ بن جاتا ہے۔

ان دونوں کو ہی کام نمٹانے کی جلدی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی تھیں۔

تین بجے اردلی معمول کے مطابق پانی لانے کے لئے بیل گاڑی لے کر نکل گیا تھا۔

لاجونتی نے پُرتشویش نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ گزشتہ روز سے جب وہ اس وہم میں مبتلا ہوئی تھی کہ وہ بیگاری سجاد اور اس کے تعلق کے بارے میں جانتا ہے' اسے اس کی موجودگی گراں گزرنے لگی تھی۔ وہ اسے برا لگنے لگا تھا۔

راگھو داس نے بھی جاتے ہوئے اپنی مالکن کو کن انکھیوں سے دیکھا تھا۔ مالکن کو اس کی آنکھوں میں شبہات کی جھلکیاں نظر آئی تھیں۔

لاجونتی مشین چلاتی رہی۔ ہلکی زرد دھوپ میں اس کے ہاتھ کے کنگن چمک رہے تھے۔ اس نے پیشانی پر جھک آنے والوں بالوں کو سر جھٹک کر پیچھے کیا۔ وہ نہا کر نکلی تھی تو بال خشک کر کے کنگھا ضرور کیا تھا لیکن بال باندھے نہیں تھے۔ سوچا تھا کہ فراک مکمل کرنے کے بعد باندھ لے گی۔ اب کھلے بال اسے پریشان کر رہے تھے۔

اس کی نگاہیں سوئی کے نیچے بھاگتے کپڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک بغیر کسی وجہ کے اس نے بے ساختہ نظریں اٹھائیں اور باغ کی اندرونی حد بندی کرنے والے ناشپاتی کے درختوں کی طرف دیکھا۔ ان درختوں کے تنوں کا نچلا حصہ جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ جھاڑیوں کے پیچھے اسے دو آنکھیں اپنی طرف دیکھتی نظر آئیں۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ ان آنکھوں میں اس کے لئے محبت ہے۔

اس کا رنگ اُڑ گیا۔ مگر اس نے یہی ظاہر کیا کہ جیسے کچھ نہیں دیکھا۔ اس نے سر جھکایا اور کام میں لگ گئی لیکن اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں اور سلائی ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ وہ اتنی نروس تھی کہ مشین سنبھال کر چلانا ممکن نہیں رہا تھا لہٰذا دھاگا نہ صرف ٹوٹا بلکہ مشین کی سُوئی سے باہر نکل گیا۔ سُوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے اس نے پھر ناشپاتی کے درختوں کی طرف نظریں اٹھائیں۔

وہ آنکھیں اب بھی اس کی جانب نگران تھیں۔

اس کی دھڑکنیں تیز اور بے ربط ہونے لگیں۔ وہ جان گئی کہ فیصلے کا لمحہ آ پہنچا ہے۔ وہ اس بار بھوک سے مجبور ہو کر نہیں' بلکہ اس سے ملنے کے لئے آیا ہے۔ صرف اس کی خاطر آیا ہے۔ عزت اور وقار کی آزمائش کا وقت آ گیا تھا۔ ایک طرف اس کی عزت اور بزدلی تھی.......... خوف تھا اور دوسری طرف اس سے ملنے کی تڑپ.......... وہ جذبوں کے بے نقاب ہونے کا وقت تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر سچ بولنے کا وقت تھا۔

اس نے سوچا' آج میں اسے سمجھا دوں گی کہ آئندہ کبھی یہاں نہ آئے۔ مگر اُسے خود بھی اعتماد نہیں تھا کہ اس سے اتنی رکھائی سے بات کر سکے گی۔ اسے تو محض یہ سوچنے سے ہی دلی تکلیف ہوئی تھی۔ اس نے اپنی تنہائی کی اذیت کا حساب لگایا پھر صورتِ حال کو محسوس کرنے کی کوشش کرنے کی۔ اسے لگا سجاد سے اس کا بڑا پرانا تعلق ہے۔ شاید پچھلے جنم کا.......... بلکہ جنم جنم کا۔ اس احساس نے اسے متعجب کیا۔ اس کی پریشانی بڑھ گئی۔ اب تک اس نے محبت کے جن کو لاشعور کی بوتل میں بند کر کے رکھا تھا مگر اب جانے کیسے اس بوتل کا ڈھکنا کھل گیا تھا اور وہ جن اسے آنکھیں دکھا رہا تھا۔

اس وقت وہ منقسم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے وجود کا ایک حصہ لپک کر سجاد تک پہنچنا چاہ رہا تھا جبکہ دوسرا حصہ اسے تنبیہہ کر رہا تھا کہ وہ اپنی جگہ بیٹھی رہے۔ اگر اس نے یہ ظاہر کیا کہ اس نے اسے نہیں دیکھا ہے تو سجاد سمجھ جائے گا کہ اس کے لئے واپس چلے جانا ہی بہتر ہے۔

اس نے سوچا درمیان کی کوئی راہ نکالی جائے۔ سمجھوتا تو ممکن ہے اور سمجھوتا کرنا بھی پڑتا ہے۔ کیوں نہ وہ اس کے پاس چلی جائے اور جا کر اسے سمجھائے.......... وضاحت کرے کہ اسے آئندہ یہاں نہیں آنا چاہئے۔ اسے سوچنا چاہئے کہ اگر اس کے شوہر کو علم ہو گیا کہ وہ اس کے گھر آتا رہتا ہے تو اس کا کیا انجام ہو گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ خود بھی پریشان ہو گئی۔ اس خیال نے اس کی قوتِ عمل کو تحریک دی۔ اسے کچھ کرنے پر نہ صرف اکسایا بلکہ اسے حوصلہ بھی بخشا۔

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "یہ گھنٹی کی آواز سنی تم نے؟" وہ جمنا سے مخاطب تھی۔ اس کی آواز میں ذرا بھی لرزش نہیں تھی۔

جمنا نے چونک کر سر اٹھایا۔ "جی میں نے تو نہیں سنی۔"

"بالکل صاف آواز سنائی دی ہے۔" لاجونتی نے اصرار کیا۔

"میرا دھیان شاید کام میں تھا۔" جمنا نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"میں جا کر دیکھتی ہوں۔ کبھی کبھی کتے بھی اندر آ جاتے ہیں۔"

اسے اپنی آواز خود بھی اپنی نہیں' کسی اور کی لگی۔ اسے شک ہونے لگا کہ اس نے

فیصلہ اتنی آسانی سے کیا ہے کہ وہ مضبوط ثابت نہیں ہو گا۔ وہ اس پر عمل نہیں کر سکے گی لیکن اب وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ ناشپاتی کے درختوں کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔ قدم پیچھے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

وہ ناشپاتی کے درختوں کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں جھاڑیوں کے پیچھے وہ ایک پتھر پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے پاس رکے بغیر گزر گئی اور ہونٹوں کے درمیان تھرکتی مسکراہٹ چھپانے کے لئے اپنا چہرہ بھی دوسری طرف کر لیا۔ البتہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کہا۔ "میرے پیچھے آؤ۔"

باغ کاٹیج کی نسبت نشیب میں تھا۔ وہ اس طرف بڑھتی گئی۔ لیموں کے بڑے درخت کے نیچے پہنچ کر وہ رک گئی اور پلٹ کر دیکھا۔ سجاد جھکا جھکا اس کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ لاجونتی نے اپنے چہرے پر تشویش اور غصے کا تاثر طاری کرنے کی کوشش کی لیکن لبوں پر تھرکتی مسکراہٹ لبوں سے نہیں ہٹی۔

وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ تب لاجونتی کو احساس ہوا کہ اس نے یہاں تک آ کر غلطی کی ہے۔ جس ارادے کے تحت وہ یہاں یہاں آئی تھی وہ وہیں پورا کیا جا سکتا تھا۔ یہاں آنا تو اسے ایک طرح سے دعوت دینا تھا۔

بہرحال اس کے پاس اس کے جذبوں کو سرد کر دینے والے لفظ موجود تھے۔ وہ کہہ سکتی تھی' کہو اب کیا بات ہے؟ کیا چاہئے یا تمہیں احساس نہیں کہ یہاں آ کر تم نے کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے لیکن اسے اس کی آنکھوں میں خوشی اور خوشی کی گرم جوشی نظر آئی۔ اپنے لفظ اسے بے رحم اور حقیر لگنے لگے۔ وہ انہیں بھول گئی۔

سجاد نے اس کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے۔ اس نے اپنے ہاتھ ان ہاتھوں کی پناہ میں دے دیئے۔

وہ بہت ترو تازہ لگ رہا تھا۔ اس کے جسم سے ٹائلٹ سوپ کی مہک اٹھ رہی تھی۔ اپنے کپڑے اس نے دھوئے بھی تھے اور استری بھی کی تھی لیکن استری ٹھیک طرح سے نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس کے دیئے ہوئے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ پھر سہ پہر کی نرم دھوپ میں لاجونتی کی نظریں جوتوں سے اٹھیں اور اس کے مضبوط جسم سے گزرتی ہوئی اس کے جوان اور خوبصورت چہرے پر آ رکیں۔ اس کے وجود میں میٹھی سی ایک بھوک

جاگ اٹھی۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھتی رہی۔ اس کی ٹھوڑی بہت خوشنما اور مضبوط تھی۔ اُس کے ہونٹ ہر وقت خفیف سے کھلے رہتے تھے ان کی وجہ سے وہ خاموشی میں بھی بولتا معلوم ہوتا تھا۔

لاجونتی کے اندر.......... بہت گہرائی میں ایک موہوم سی امید ایک بے نام خوشی انگڑائی لینے لگی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اس کے اندر ایک ایسی تڑپ.......... ایسی پیاس مچل رہی تھی جس کے بارے میں وہ جانتی تھی کہ اسے پنپنے کا موقع نہیں ملنا چاہئے۔ ورنہ وہ اس کی غلام ہو کر رہ جائے گی۔

سجاد کی مسکراہٹ میں بے یقینی بھی تھی اور شرمندگی بھی۔ "میں پھر آگیا۔" وہ بولا۔

اس کی شرمندگی نے لاجونتی کو حوصلہ دیا۔ "تم کیمپ سے کیسے نکل آتے ہو آخر؟" اس نے پوچھا۔

"میں ایک گورے صاحب کی خدمت پر مامور ہوں۔"

"گورے صاحب کی؟" لاجونتی نے حیرت سے دہرایا۔

"جی ہاں' کہتے ہیں کہ وہ روسی ہے' بھارت سرکار کا دوست۔"

"اس کا یہاں کیا کام؟"

"مجھے تو جاسوس لگتا ہے۔"

"خیر ہو گا میں نے پوچھا تم کیمپ سے کیسے نکل آتے ہو؟"

"وہ شراب بہت پیتا ہے اور یہ وہ وقت ہے جب وہ سو جاتا ہے سو مجھے چھٹی مل جاتی ہے لیکن وہ بدبخت رات کو کم ہی سوتا ہے لہٰذا مجھے بھی جاگنا پڑتا ہے۔"

"تمہیں اسے شراب پینے سے روکنا چاہئے۔"

"شراب کے بغیر وہ جی نہیں سکتا۔ کوئی اسے پینے سے روک بھی نہیں سکتا۔"

"تو تم اس کی آیا ہو۔" لاجونتی نے محض گفتگو جاری رکھنے کے لئے کہا۔ وہ اس کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔

سجاد کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ "میں بیگاری ہوں۔ مجھے جو کام دیا جائے گا کروں گا۔ پڑھا لکھا ہوں تو ڈیوڈ صاحب کی آیا بنا دیا گیا ہوں ورنہ گڑھے کھودتا' محنت کا کام کرتا۔ یہاں

اپنے اختیار میں تو کچھ ہے ہی نہیں۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

"برا مان گئے۔ سوری۔"

سجاد نے لیموں کے درخت سے ایک پتا توڑا اور اسے انگلیوں میں گھماتا رہا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یوں اِدھر اُدھر کی باتوں سے کب تک کام چل سکے گا۔ لاجونتی کو شک ہوا کہ وہ اس سے کچھ کہنے کے لئے تیاری کر کے آیا تھا' جو کہنے کی اب ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ وہ فکرمند ہو گئی۔

سجاد نے اس کی فکرمندی محسوس کر لی۔ وہ مسکرایا۔ "میں آپ کے لئے پریشانی کا باعث ہو گیا ہوں نا؟"

"نہیں' ایسا کیوں ہونے لگا۔" لاجونتی نے بے نیازی سے کہا۔

"آج میں تیسری باری یہاں آیا ہوں اور یہ آخری بار بھی نہیں۔ اس لئے کہ میں آتا رہوں گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس اس میں تمہارے لئے خطرہ ہے۔" لاجونتی نے بے ساختہ کہا۔

"سنیں۔ میں آج آپ سے کھانا مانگنے نہیں' آپ سے ملنے آیا ہوں۔" وہ شرمیلے پن سے بولا۔ اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔

لاجونتی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ یہ بات جانتی تھی پھر بھی اس کے منہ سے سن تو گنگ ہو کر رہ گئی۔

وہ بدستور شرمیلے لہجے میں کہتا رہا۔ "میں آدھے گھنٹے سے یہاں بیٹھا آپ کو دیکھ رہا تھا۔ آپ مجھے نظرانداز کر سکتی تھیں' یہ ظاہر کر سکتی تھیں کہ جیسے مجھے دیکھا ہی نہیں' آپ یہاں کیوں آ گئیں؟"

"میں نہیں چاہتی تھی کہ جمنا تمہیں دیکھے اور میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے یہ بات پسند نہیں.........." وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر وہ بولی تو اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ جو جملہ وہ کہنا چاہتی تھی' بدل گیا۔ "مجھے پسند نہیں کہ تم خود کو میری خاطر اتنے بڑے خطرے سے دوچار کرو۔"

سجاد کے چہرے کا تاثر دیکھتے ہی دیکھتے بدل گیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

لاجونتی کو ان آنکھوں سے ڈر لگنے لگا۔ اس سے پہلے کبھی کسی نے اسے ایسی محبت سے نہیں دیکھا تھا۔ ان نظروں میں تڑپ بھی تھی اور گرسنگی بھی، اور سجاد نے اپنے محسوسات چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اس کے انداز سے یہ بھی نہیں لگتا تھا کہ وہ اس پر شرمندہ ہے۔ لاجونتی کو لگا کہ سجاد نے اپنی آنکھوں کے ذریعے اس پر اپنا باطن کھول کر رکھ دیا ہے اور ان آنکھوں میں دیکھنے کے بعد لاجونتی کو یقین ہو گیا کہ ان کے درمیان جنموں پرانا رشتہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں۔ آنکھوں کا وہ تاثر بھی جانا پہچانا تھا۔

لاجونتی نے جان لیا کہ ارادے کے بغیر سہی، وہ سجاد کی آنکھوں کے تاثر کے جواب میں مثبت ردِعمل ظاہر کر رہی ہے۔ اس ردِعمل کا منبع بھی اس کے اپنے باطن کی انتہائی گہرائی تھی۔ اس کے اندر بڑی نرم و نازک سی وحشت مچل رہی تھی۔ اس کی سانسیں الجھنے لگیں۔ دھڑکنوں کی لے بہت تیز ہو گئی۔ اس نے سجاد کے چہرے سے اپنی نظریں ہٹانے کی کوشش کی تاکہ اس وحشت سے لڑ سکے۔ اس کا گلا گھونٹ سکے۔ وہ التجا کرتی............ وعدہ کرتی ان آنکھوں سے دور............ بہت دور بھاگ جانا چاہتی تھی جو اسے خواب دکھا رہی تھیں لیکن وہ نظریں نہ ہٹا سکی۔ وہ خاموش کھڑی اس کی آواز کو سنتی رہی جو اس کے دل کو چھو رہی تھی۔

"آپ سے ملنا میری ضرورت ہے۔" سجاد کہہ رہا تھا۔ "آپ کا خیال دل میں ہو اور میں آپ کے بارے میں سوچ رہا ہوں تو میں ہر تکلیف برداشت کر سکتا ہوں۔ کیمپ کی اذیت ناک زندگی بھی ناقابلِ برداشت نہیں لگتی۔ آپ کے ساتھ یہاں چند منٹ گزار لوں تو زندگی پر میرا اعتماد بحال ہو جاتا ہے۔"

لاجونتی حیران تھی کہ وہ کتنی مشکل باتیں کتنی آسانی سے کہہ رہا ہے۔ شاید وہ علم محبت کا کمال تھا۔ "لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔" وہ بولی۔

"جاننے کو ہے ہی کیا۔ میں کشمیری ہوں۔ اتنا ہی کافی ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا ضروری نہیں کہ میں قیدی ہوں یا بیگاری ہوں۔ بھارت نے لفظ کشمیری کو اتنا وسیع مفہوم دے دیا ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی۔" اس کے لہجے میں مظلومیت نہیں، تلخی تھی............ ایک مضبوطی تھی، کسی جذبے کی گھن گرج تھی اس کی آواز میں۔ "میں بس ایک کشمیری مسلمان ہوں۔"

اس کے دکھ نے بھی لاجونتی کے دل کو چھو لیا تھا۔ اس نے سوچا ہندو سہی، کشمیری تو میں بھی ہوں۔ قیدی بھی ہوں اور بیگاری بھی۔ اس نے بے حد مستحکم لہجے میں پوچھا۔ "شادی ہو چکی ہے تمہاری؟" یہ سوال خود اس کے لئے بھی حیرانی کا باعث تھا۔

وہ مسکرایا۔ "جی نہیں۔"

لاجونتی اچانک پریشان ہو گئی۔ اس نے متوحش نظروں سے کاٹیج کی طرف دیکھا۔ "مجھے بہت دیر ہو گئی ہے، جمنا پریشان ہو رہی ہو گی۔" اس نے کہا۔ "کہیں وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی یہاں تک نہ آ جائے۔

"ابھی نہ جاؤ پلیز۔"

"مجھے جانا ہے سجاد۔ سلائی بھی کرنی ہے۔" لاجونتی نے کہا اور جیسے ہی اسے فراک کا خیال آیا، اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں رہا۔ اسے وہ فراک آج ہی مکمل کرنا تھی۔ اس خیال نے اس کے پورے وجود پر قبضہ کر لیا۔ اس کی خوشی بخارات کی طرح اُڑ گئی۔ اس کا ذہن بھی منقسم ہو گیا۔ "میں فراک کے لئے پریشان ہوں" اس کے ذہن کے ایک حصے نے کہا۔ دوسرے حصے نے جواب دیا۔ "نہیں فراک کے لئے نہیں، تم کسی اور بات سے پریشان ہو۔ تم اس مرد کے لئے پریشان ہو۔ کل یہ پھر آئے گا۔"

اس کا جسم خوف سے لرزنے لگا۔

سجاد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ سچ مچ جا رہی ہیں؟"

"مجھے جانا ہے۔"

اس نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے کندھوں پر محسوس کیا۔ اس کے جسم میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ اس ہم آغوشی سے گھبرا کر پیچھے ہٹی لیکن سجاد نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ پانی سے لدے بادل پیاسی دھرتی پر جھک آئے۔

وہ عورت تھی کوئی کچی عمر کی لڑکی نہیں۔ مگر اس لمحے نے............ اس قربت نے اسے احساس دلایا کہ وہ عورت ہو کر بھی لڑکی ہی ہے۔ وہ ایسی دھرتی تھی، جس پر برف باری تو ہوتی رہی تھی بارش کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اس نے بڑی تندی سے خود کو چھڑایا اور ڈگمگاتے قدموں سے کاٹیج کی طرف بھاگی۔ خوف، شرم اور ہیجان سے اس کا جسم جل رہا تھا۔ شہتوت کے درختوں کے درمیان سے

گزرتے ہوئے اس نے سجاد کی آواز سنی۔

"میں کل پھر آؤں گا۔"

☆=====☆=====☆

جذبات کی دنیا میں لاجونتی ایک مفلس و قلاش عورت تھی۔

اس سہ پہر جو کچھ ہوا اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ متضاد کیفیات کا شکار ہو گئی۔ وہ اس سے خوف زدہ بھی تھی اور وہ اسے اچھا بھی لگا تھا۔ وہ رات اس کے لئے بہت سخت تھی۔ آنکھوں میں نیند کا نام و نشاں بھی نہیں تھا۔ وہ بستر پر لیٹی متضاد جذبوں کا کھلونا بنی الجھتی رہی۔

اس کے برابر کرنل لیٹا بے خبر سو رہا تھا۔ وہ خراٹے بھی لے رہا تھا۔ خراٹوں کی آواز اسے چڑا رہی تھی۔ دیر سے وہ سوچ رہی تھی کہ لیموں کے درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ آخرکار کرنل کے خراٹوں نے اسے فیصلہ کرنے میں مدد دی۔

مگر فیصلہ کرتے ہی اسے شاک لگا۔ کرنل تو ہمیشہ سے خراٹے لیتا آیا تھا لیکن خراٹے اتنے بُرے پہلے کبھی نہیں لگے تھے۔

وہ اٹھی اور کاٹیج سے نکل آئی۔ جانے پہچانے راستے سے گزر کر وہ لیموں کے درخت تک پہنچی۔ پہلی بار لیموں کے اس درخت سے اسے محبت محسوس ہوئی۔ وہ حیرت سے سوچتی رہی۔ کیا چند گھنٹوں میں سب کچھ بدل سکتا ہے۔ لیموں کا وہ درخت برسوں سے وہاں موجود تھا لیکن اسے کبھی اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ اب محض چند گھنٹوں میں وہی درخت اسے اتنا پیارا ہو گیا تھا۔

مگر وہ اب بھی تسلیم نہیں کر رہی تھی کہ یہ انقلابِ محبت ہے۔

وہ پیڑ کے سائے میں بیٹھی قربت کے ان انقلاب آفریں لمحوں کو دہراتی رہی۔ نیند اور سکون قطرہ قطرہ اس کے وجود میں ٹپکتے رہے۔ اس سکون کی کوئی حد نہیں تھی۔ آخر کار وہ اٹھ کر کاٹیج میں چلی آئی۔ اس بار کرنل کے خراٹے بھی اس کی نیند کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکے۔

صبح وہ سو کر اٹھی تو ایک اور فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ اب سجاد سے

کبھی نہیں ملے گی۔ وہ اپنے جذبات کو اپنے اوپر حکمرانی نہیں کرنے دے گی۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ سجاد نے واقعی دوبارہ آنے کو کہا یا اس کی خواہشات کی شدت نے اسے یہ بات سنوائی تھی۔ اپنے حواسوں پر اس کا اعتبار کم ہو گیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ اپنے طلسم میں گرفتار ہو گئی ہے۔ بلکہ اب تو وہ یہاں تک سوچ رہی تھی کہ گزشتہ روز کی اس کی اور سجاد کی قربت حقیقی تھی یا وہ بھی اس کے تصور کا کرشمہ تھا۔ جو کچھ بھی ہو' اس نے فیصلہ کیا کہ اس معاملے کو ذہن سے جھٹکنا بہت ضروری ہے۔ اس نے سوچ لیا کہ آج جمنا کو شام تک روکے رکھے گی تاکہ سجاد سے ملاقات کا امکان ہی نہ رہے۔

لیکن جب جمنا کے جانے کا وقت آیا تو لاجونتی نے اسے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس وہ کسی ایسے چور کی سی بے پروائی سے جو کسی عینی شاہد سے پیچھا چھڑاتا ہے' ملازمہ کو گھر سے رخصت ہوتے دیکھتی رہی۔

اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کبھی تو اسے لگتا کہ دل بھی ساکت ہو گیا ہے اور سانسیں بھی رک گئی ہیں۔ اس کے قدم خودبخود لیموں کے درخت کی طرف اٹھنے لگے۔ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ وہ لیموں کے درخت کے نیچے کھڑی ہے۔ وہ اتنی کمزوری محسوس کر رہی تھی کہ اسے درخت کے سائے میں بیٹھنا پڑا۔

وہ وہاں بیٹھی رہی۔ اس کا جسم اور خصوصاً ٹانگیں بری طرح کپکپا رہی تھیں۔ مگر جیسے ہی اس نے سجاد کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا اس کا جی چاہا کہ لپک کر جائے اور اس سے لپٹ جائے۔ دوسری طرف ایک متضاد جذبہ ابھرا۔ اس کا بس چلتا تو وہاں سے دیوانہ وار بھاگ کھڑی ہوتی۔ سجاد سے دور.......... اور خود کو کاٹیج میں بند کر لیتی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ قریب آ چکا تھا اور پھر اس کا خواہشوں کے بوجھ تلے دبا جسم اسے روک رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

اُس روز کے بعد لاجونتی نے خود کو پہچاننا چھوڑ دیا۔ زندگی اب جیسے صرف لیموں کے اس پیڑ کے سائے میں رہ گئی تھی۔ وہ درخت اب اس کے وجود کا استعارہ تھا۔ وہ واضح طور پر منقسم ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے وہ ایک تنہا' خاموش طبع اور دبی ہوئی.......... کچلی ہوئی عورت تھی جو بڑی بے حسی سے ناگزیر بڑھاپے کی منتظر تھی۔ وہ نئی عورت

اسیر محبت تھی۔ جس نے فتح کے یقین کی بنیاد پر ہر مخالف دلیل کو مسترد کر دیا تھا۔ اب وہ زندگی سے آزادی اور مسرت کا مطالبہ کر رہی تھی۔

اس نئی لاجونتی نے اپنے اندر مکمل نسوانیت کو جگا دیا تھا جسے گزرے ہوئے بے سکون برسوں نے دبا رکھا تھا۔ وہ نسوانیت اس چشمے کی طرح پھوٹی تھی جس کے پانی کو زمین نے برسوں بھینچ کر رکھا ہو اور جسے آخر کار پھوٹ نکلنے کے لئے ایک رخنہ میسر آ گیا ہو۔

ہر سہ پہر وہ لیموں کے درخت کے نیچے سجاد کا انتظار کرتی۔ انتظار کے ان لمحوں میں اس کا جسم خواہش کی تال پر تھرکتا۔ اردگرد کی خاموشی اسے جذبات برانگیختہ کرنے والی محسوس ہوتی اور جب وہ اس کے موڑے ہوئے تاروں کے نیچے سے گزر کر باغ میں داخل ہوتا.......... اس کی طرف بڑھتا تو اسے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوتیں۔

اب ضمیر کی کوئی خلش اسے پریشان نہیں کرتی تھی۔ اب وہ ہچکچاتی نہیں تھی۔ اسے کسی بات کا خوف نہیں تھا۔ سجاد کے لئے اس کی محبت تندتر ہوتی جا رہی تھی۔ اب اس کے نزدیک وہ ایک دیوتا تھا اور وہ خود پجارن۔ اس نے خود کو مکمل طور پر اس کے سپرد کر دیا تھا۔ دونوں جو وقت لیموں کے درخت کے نیچے گزارتے' اس کا ایک ایک پل ان کے لیے بے حد قیمتی ہوتا۔ وہ ایک ایک پل سے لذت کشید کرتے۔ لاجونتی نے پہلے کبھی کسی کے لئے مکمل سپردگی محسوس ہی نہیں کی تھی۔ پہلی بار خوشی کا مفہوم اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ وہ تو واقف ہی نہیں تھی کہ اس کے اندر کیسی شدید' کیسی خوب صورت محبت چھپی ہوئی ہے۔ اب اس نے جانا کہ محبت کی جائے تو جینا کتنا مسرت خیز عمل ہوتا ہے۔

وہ ایک پل بھی ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ آخری لمحے تک اسے روکے رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس وقت بھی جب اسے احساس ہوتا کہ راگھو داس گھر واپسی کے لئے چل پڑا ہو گا۔ اسے کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے گھر کو' اپنے پتی کو بھول بیٹھی تھی۔

سجاد کی واپسی کے بعد وہ کاٹیج واپس جاتی تو اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا ہوتا۔ آنکھوں کی کیفیت یہ ہوتی جیسے اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہو۔ وہ برآمدے میں کاٹیج کی طرف پشت کر کے بینچ پر بیٹھ جاتی۔ خوشی سے نڈھال وہ سجاد کی قربت کے کیف آگیں

وقت کے سائے میں دوبارہ جیتی.......... اپنے تصور میں۔

لیموں کا درخت اس کے لئے ایک شخصیت کا روپ دھار گیا۔ دور ہوتی تو وہ اسے یوں چپکے چپکے دیکھتی جیسے کوئی اپنے کسی چہیتے اور معتمد رازدار کو دیکھتا ہے۔ شام کا جھٹ پٹا اترتا تو وہ درخت کے پاس چلی جاتی۔ ایسے میں اس کا دماغ یادوں کے چراغوں سے جگمگ جگمگ کرتا۔ وہ خواب کی سی کیفیت میں جاگتی آنکھوں خواب دیکھتی۔ اپنی خوشیون پر اس کے وجود میں ہر زندہ شے کے لئے شکر گزاری اور محبت کا دریا بہتا۔

اس کا بدن ہر لمس کے معاملے میں بے حد ذکی الحس ہو گیا تھا۔ اس کے پیروں کو خشک زمین کی گرمی اور تپش محسوس ہوتی۔ ہوا اس کی جلد کو چھوتی تو جلد کا ردِ عمل بے حد مسرت آمیز ہوتا۔ روشنی چھوتی تو اس کی آنکھیں ستاروں بھرے آسمان کی طرح مسکرا اٹھتیں۔ گرد و پیش اسے بالکل بدلا ہوا اور نیا نیا لگتا جیسے کسی نے جادو کے زور پر اسے خوب صورتی کا روپ دے کر تبدیل کر دیا ہو۔ البتہ کاٹیج اس جادو کے حلقۂ اثر سے باہر رہا تھا۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح.......... بلکہ پہلے سے بھی زیادہ تاریک لگتا' جیسے کوئی پرانا اور سنسان قید خانہ ہو۔ وہ کاٹیج میں بہت ہی کم وقت گزارتی۔ کبھی وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو اس کے انداز میں' اس کی ہر جنبشِ بدن میں وہ خود اعتمادی ہوتی جو ایک گرفتارِ محبت عورت کا خاصہ ہوتی ہے۔

ان دنوں اس کا رنگ بہت صاف ہو گیا تھا۔ جلد بہت نرم ہو گئی تھی اور اس میں دھوپ کے سونے کی سی چمک نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت گہری نظر آنے لگی تھیں۔ ان سے بے پناہ نرمی جھلکتی اور ان کی چمک ناقابلِ یقین حد تک بڑھ گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں پر ہر وقت ایک دبی دبی مسکراہٹ تھرکتی رہتی۔

وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھتی تو اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگتی۔ وہ بھاگ کر کاٹیج سے باہر جاتی اور لیموں کے درخت کو محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سر کو یوں جنبش دیتی جیسے پوچھ رہی ہو' تم ٹھیک تو ہو میرے دوست؟ اس کا وہ حسن اس درخت ہی کا مرہونِ منت تھا لیکن کبھی کبھی اس درخت کو دیکھ کر وہ اداس ہو جاتی جیسے اپنی جوانی کے رائیگاں اور بے رنگ گزرے ہوئے دن یاد آ گئے ہوں۔ اس پر یہ خوف طاری ہونے لگتا کہ اس کا اپنا بڑھاپا بھی زیادہ دور نہیں۔ بڑھاپے کا خیال اس پر اس کے بوڑھے شوہر

نے مسلط کیا تھا اور اس سے پیچھا چھڑانا آسان نہیں تھا لیکن جیسے ہی اسے سجاد کا خیال آتا' خوشیاں لوٹ آتیں' ہر خوف ڈھل جاتا۔ اس کے دل میں ایک خیال آتا اپنے شوہر کو چھوڑ کر سجاد کے ساتھ بھاگ جانے کا خیال اور اور اس خیال کے ساتھ احساسِ جرم کبھی نہ ابھرتا۔ اس لئے کہ وہ سجاد کے پیچھے چلنے کا عہد کر چکی تھی۔

اس کی خود اعتمادی بڑھتی گئی۔ اس کی ہنسی میں کھنک اتر آئی۔ اس کی آواز میں اور دھیمے لہجے میں ایسی آنچ سما گئی جو اس کا راز کھول سکتی تھی۔ اس کی چال بے رنگ نہ رہی۔ اس میں مستانہ پن پیدا ہو گیا۔ قدموں میں چستی آ گئی' ہاتھوں کی مضطربانہ حرکت موقوف ہو گئی۔

جمنا نے یہ تبدیلی محسوس کر لی اور اس تبدیلی سے خوش بھی ہوئی۔ ایک دن وہ بولی۔ "مالکن آپ تو لڑکی لگنے لگی ہیں۔"

"تمہیں لگتا ہو گا ایسا۔"

"نہیں مالکن۔ آپ بدل گئی ہیں' نئی نئی لگتی ہیں اب۔"

"کمال ہے! مجھے تو ایسا محسوس نہیں ہوا۔" لاجونتی نے جھوٹ بولا۔

"آپ کا من شانت ہو گیا ہے۔ آتما کو شانتی مل جائے تو عورت جوان ہو جاتی ہے' سدا بہار۔" بڈھی جمنا نے کہا۔

اس سادہ سچائی نے لاجونتی کو حیران کر دیا۔

☆=====☆=====☆

ایک بندھن ایسا تھا' جسے وہ توڑ نہیں سکتی تھی اور وہ بندھن تھا اس کا ماضی' اور اس کا بڈھا شوہر اس ماضی کا ایک حصہ تھا۔

علاقائی خبریں بتدریج پریشان کن ہوتی جا رہی تھیں لیکن لاجونتی کو محبت کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں رہ رہی تھی۔ خبریں اس تک پہنچتی تھیں لیکن وہ انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتی تھیں۔

کرنل اجیت ان دنوں اتنا پریشان تھا کہ اسے بھی توجہ نہیں دے پاتا تھا۔ وہ تمام وقت کشمیری مسلمانوں کو برا بھلا کہتا رہتا تھا۔ اس کے نزدیک اس کی پریشانیوں کا سبب وہی تھے۔

اسکول ماسٹر گنگا دھر کا کہنا تھا کہ مسلمان لڑاکے کشمیر میں باقاعدہ مسلح جدوجہد شروع کرنے والے ہیں۔ کرنل کی پریشانی اس بات کی تصدیق کر رہی تھی۔ ایک روز کرنل نے بیوی کو بتایا کہ بھارت سے مزید فوجی دستے کشمیر آنے والے ہیں۔

"اس کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟" لاجونتی نے پوچھا۔

"پاکستان سے بڑی تعداد میں تخریب کار یہاں گھس آئے ہیں۔" کرنل نے کہا۔

"چھوٹے پیمانے پر خطرناک تخریبی کارروائیاں شروع ہو گئی ہیں۔ صورتِ حال بہت خراب ہے اس لئے مزید فوج طلب کی گئی ہے۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ کشمیری مسلمانوں نے کوئی تنظیم بنا لی ہے اور وہ مسلح جدوجہد شروع کرنے والے ہیں۔" لاجونتی بولی۔

"اس فساد کا مرکز پاکستان ہی ہے۔ کشمیریوں میں اتنا دم نہیں۔"

"تمہاری انٹیلی جنس کیا کہتی ہے؟" لاجونتی نے پوچھا۔ "اور اس معراج میر اور اس کی تنظیم کے متعلق کچھ معلوم ہوا؟"

"کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی۔ یہ پتا چلا ہے کہ معراج میر کو پاکستان میں تربیت دی گئی ہے۔ اس بار ہم پاکستان پر ہی فیصلہ کن ضرب لگائیں گے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

"یہاں روسی بھی آئے ہوئے ہیں کیا؟"

کرنل بُری طرح چونکا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا؟"

لاجونتی بھی گڑبڑا گئی۔ "مجھے کیا' یہ تو پورے گاؤں کو پتا ہے۔"

"حالانکہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔" کرنل بڑبڑایا۔ "کم بختوں کو لاکھ سمجھایا لیکن باہر نکلنے سے باز ہی نہیں آتے۔ وہ بھی تو مسئلہ بنے ہوئے ہیں میرے لئے۔ انہیں میرے سر پر اس طرح مسلط کر دیا گیا ہے کہ میں انہیں حکم بھی نہیں دے سکتا۔ بدنظمی کا سامان ہیں وہ لوگ۔"

لاجونتی نے ان لوگوں کے بارے میں کرید کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کرنل کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ ان کی یہاں موجودگی کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نے ان کا تذکرہ نکال کر ہی غلطی کی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ بات بن گئی لیکن وہ لوگ بہرحال اس کے

لئے ایک خلش بن گئے۔

صورتِ حال روز بہ روز بگڑتی گئی۔ تقریباً ہر روز کہیں نہ کہیں دھماکے ہونے لگے۔ بھارت سے مزید فوجی دستے آ گئے تھے۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ انٹیلی جنس کا کہنا تھا کہ عنقریب کشمیری لڑاکوں کی تنظیم کی اپیل پر شہروں میں ہڑتالوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور ایسا ہوا تو صورتِ حال ہر اعتبار سے قابو سے باہر ہو جائے گی۔ اس کا واحد حل یہ تھا کہ یہ نوبت آنے سے پہلے ہی اس تنظیم کو کچل دیا جائے۔

اب کرنل لنچ کرنے آتا تو بہت کم بولتا۔ وہ بہت نروس لگتا۔ شکایت کرتا کہ اسے بھوک نہیں لگتی۔ جلے کٹے انداز میں خبریں سناتا۔ غیر ملکی ماہرین سے وہ بہت عاجز تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بیگاریوں کے دماغ خراب کئے دے رہے ہیں۔ "وہ ان کے مزاج سے ناواقف ہیں۔" ایک دن اس نے کہا۔ "نہیں سمجھتے کہ وہ ڈنڈے کے یار ہیں۔ انہیں وہ مراعات دیتے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سمجھتے ہیں ہم سے زیادہ ان کی نفسیات سمجھتے ہیں۔"

تھوڑا بہت زہر مار کرنے کے بعد وہ پاؤں پھیلا کر اونگھنے لگتا۔ لاجونتی اسے زبردستی بستر پر لے جاتی۔ "تھوڑی دیر لیٹ کر آرام کر لو۔" وہ کہتی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کے شوہر کی صحت تباہ ہو رہی ہے۔ اس کا وزن تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر کو دھنس رہی تھیں۔ کنپٹیوں اور جبڑوں کی ہڈیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ رخسار بھی اندر دھنس گئے تھے۔ آنکھوں میں چمک نہیں رہی تھی۔ وہ پھیکی اور بے رنگ ہو رہی تھیں۔

لاجونتی اب اس کا پہلے سے زیادہ خیال رکھتی تھی۔ اکثر راتوں کو وہ سوچتی۔ میں اتنی خوش ہوں اور یہ اتنا ناخوش اور پریشان ہے۔ یہ تصور اسے اداس کر دیتا۔ وہ جیسا بھی تھا اس کا شوہر تھا اور پتی کی سیوا اس کا دھرم تھا۔ وہ اپنی بے وفائی پر اندر ہی اندر کڑھتی' خود کو برا بھلا کہتی۔ اسے یاد آتا کہ وہ اس کی موت کی آرزو کرتی رہی ہے تو وہ خود سے بھی خوف زدہ ہو جاتی۔ اب اسے اس پر بس رحم آتا تھا۔

ہر روز وہ سوچتی کہ آج جا کر سجاد کو منع کر دے گی کہ آئندہ اس سے ملنے نہ آئے لیکن جب ملن کا وقت آتا تو وہ بے تاب ہو جاتی۔ سب کچھ بھول جاتی۔ سجاد کو آنے میں دیر ہوتی تو وہ اس کے لئے تڑپتی۔ ہر پل اسے موت کی سی اذیت ہوتی۔

جب سے محبت کا کھیل شروع ہوا تھا وہ ہر شام بڑی بے تابی اور تشویش سے اپنے شوہر کی آمد کا انتظار کرتی۔ اسے یہ فکر ستاتی کہ کبھی یہ بھید کھل گیا تو اس کے محبوب کو بڑی اذیت ناک موت ملے گی۔ جبکہ وہ نہیں چاہتی کہ اس پر کوئی آنچ بھی آئے۔

ابتدا میں تو کرنل اجیت کو احساس بھی نہ ہوا کہ اسے بیوی کی طرف سے زیادہ توجہ مل رہی ہے لیکن جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو وہ چڑ گیا......... مشتعل ہو گیا۔ اسے یہ اچھا لگتا تھا کہ بیوی اس کی آمد کا انتظار کرے لیکن اسے یہ پسند نہیں تھا کہ اس کا بچوں کی طرح خیال رکھا جائے۔

ایک رات کھانے کے دوران پریشانی کے باوجود کرنل کو بیوی میں تبدیلی نظر آ گئی۔
"ان دنوں تم بہت اچھی ہو گئی ہو۔ بالکل جوان لڑکی لگتی ہو۔" اس نے کہا۔ "تم تو بہت بدل گئی ہو' چال تک مختلف ہو گئی ہے تمہاری۔"

لاجونتی نے نظریں اٹھائیں اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں اسے ملامت' شک بلکہ خوف تک کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ "کیا تم چاہتے ہو میں بڈھی ہو جاؤں؟" اس نے پوچھا۔

کرنل نے نظریں پھیر لیں۔ "بس اتنی سی بات ہے کہ مجھے حیرت ہوئی ہے۔" اس نے کہا۔ "جب تم بہت نو عمر تھیں اس وقت بھی میرے سامنے تھیں۔ میں نے تب بھی تمہیں اتنا کھلا ہوا' اتنا خوش مزاج اور تر و تازہ نہیں دیکھا اور بڈھا ہونے میں کیا برائی ہے۔ یہ تو ایک فطری عمل ہے۔ ہر شخص کبھی نہ کبھی بوڑھا ہوتا ہے۔" اس نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولا۔ "ویسے بھی تیس کی تو تم ہو چکی ہو۔"

اس لمحے لاجونتی نے جسم و جاں کی تمام تر شدت کے ساتھ کرنل سے نفرت کی تھی۔

☆=====☆=====☆

اس رات کھانے کے بعد وہ معمول کے مطابق برآمدے میں بیٹھے رہے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ کرنل کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ لاجونتی اس بے پناہ نفرت کو تسخیر کرنے کی کوشش کر رہی تھی جو اسے کرنل سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دکھی اور محروم آدمی اتنا کمینہ' اتنا چھوٹا ہو جاتا ہے کہ

وہ بس ایک ہی خواہش کرتا ہے۔ وہ اپنے دکھ اور اپنی محرومی کے دور ہونے کی اتنی خواہش نہیں کرتا۔ وہ سوچتا ہے کہ جب میں خوش نہیں تو پھر دنیا میں کسی کو خوشی میسر نہیں ہونی چاہئے۔ لاجونتی یاد کر رہی تھی کہ ابھی چند ماہ پہلے خود اس کا بھی یہی حال تھا۔ مصیبت زدہ لوگوں کے بارے میں سن کر اسے خوشی ہوتی تھی......... تو اگر اس کے بوڑھے شوہر کو اس کی جوانی سے خوف آتا ہے اور وہ اس کے قبل از وقت بوڑھے ہو جانے کی خواہش کرتا ہے تو یہ تو فطری بات ہے۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو خود محروم اور دکھی ہوں تو دوسروں کو دکھ اور محرومی سے محفوظ رہنے کی دعا دیتے ہیں مگر ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔

نفرت سے بچنے کی ایک ہی صورت ہوتی ہے۔ محبت اور محبت کی خوشیاں۔ اور محبت اسے میسر تھی۔ کرنل سے نفرت سے بچنے کے لئے اس نے سجاد کی محبت بھری یاد کے دامن میں پناہ لی۔ ستاروں بھرے آسمان پر نگاہیں جما کر وہ سجاد کے بارے میں سوچتی رہی۔ کل وہ پھر اس سے ملے گی۔ اس کی بانہوں میں سما جائے گی اور پھر اسے کچھ یاد نہیں رہے گا۔ اس کی محبت بھری بانہوں کے حصار میں وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔ وہاں عجیب پناہ تھی۔ عجیب خود فراموشی تھی۔ کل ان بانہوں کی پناہ میں وہ بھول جائے گی کہ اس کا بڈھا پتی اپنے ساتھ اسے بھی جلد از جلد بڈھا کر دینا چاہتا ہے۔

اسے احساس تھا کہ اس کے پاس جوانی کے زیادہ برس نہیں رہے ہیں۔ جلد ہی وہ ادھیڑ عمری کی سرحد میں قدم رکھے گی اور اس کے ساتھ ہی بڑھاپے کا آغاز ہو جائے گا اور وہ اپنے پتی کے لئے کیا کر سکتی ہے سوائے اس کے کہ اس کا خیال رکھے۔ جبکہ وہ اسے زندگی کی سچی خوشیاں بھی نہیں دے سکا ہے۔ یہ تو کوئی بات نہیں کہ وہ اپنی خوشیوں پر قدغن لگائے۔ خوشیوں کے حوالے سے اپنی باز پرس کرے۔ اب اس نے جان لیا تھا کہ زندگی کیا ہے اور زندگی کی سچی خوشیاں کیسی ہوتی ہیں۔ اب تو بھگوان کے حکم پر بھی وہ ان خوشیوں سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔ پتی ورتا کی تعلیم جو عمر بھر دی گئی......... جو اس کے اندر نسلوں سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے' ایک ڈھکوسلا ہے۔ پتی ورتا کے اصول بھی مردوں نے وضع کئے ہیں جو کبھی پتنی نہیں بنے لہٰذا محرومی کا مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتے۔

اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی۔ اس نے سوچا' میں اپنے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں

آنے دوں گی۔ میں سجاد کے ساتھ دور.......... کہیں دور چلی جاؤں گی۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ جاگتی آنکھوں محبت کی خواب آگیں وادی میں اترتی جا رہی ہے۔ اس پر عجیب سی بے خودی طاری ہو گئی تھی۔ اس کی سماعت میں ہوا کے مضراب کی حرکت پر لیموں کے پتوں کا سنگیت تھا۔ اس کی نگاہیں گہرے نیلے آسمان پر تھیں۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کہ کرنل اسے بڑے غور سے دیکھ رہا ہے' اس کے چہرے پر الجھن کا تاثر ہے جیسے وہ اس کے خیالات پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

کرنل اس کے چہرے کا تاثر نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ اتنا جان گیا تھا کہ وہ کسی بے حد خوب صورت خواب میں کھو گئی ہے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" آخر کار کرنل سے نہ رہا گیا۔

لاجونتی بری طرح چونکی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ "کچھ نہیں۔"

"ناممکن۔ تم اس وقت یہاں موجود ہی نہیں تھیں۔ میلوں دور تھیں یہاں سے۔ بتاؤ کیا سوچ رہی تھیں۔"

لاجونتی چڑ گئی۔ مردوں کو کتنے حقوق' کتنے اختیارات دیئے گئے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں' عورت کے خیالوں پر' تصور پر بھی ان کا اختیار ہے۔ "میں بڑھاپے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میرے بڑھاپے کے بارے میں؟"

"نہیں' اپنے بڑھاپے کے بارے میں۔"

وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "تمہارا بڑھاپا تو ابھی بہت دور ہے۔ ابھی تم زندگی سے لطف اندوز ہو سکتی ہو۔"

"میں زندگی سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتی۔" لاجونتی کے لہجے میں برہمی تھی۔

کرنل نے کرسی پر بیٹھے پہلو بدلا اور اسے ٹٹولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ "اس بات کا کیا مطلب ہوا؟"

لاجونتی نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ بہت پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس کے انداز میں سمندر کا سا ٹھہراؤ تھا۔ اس ٹھہراؤ کے پیچھے سے کرنل کو ایسی قوتِ ارادی جھانکتی نظر آئی جس کے زور پر وہ جو چاہتی کر سکتی اور جو چاہتی حاصل کر سکتی تھی۔ ایک لمحے کو کرنل

دہل کر رہ گیا۔ اس کے کندھے جھک گئے مگر پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔

"یہ تو شکایتوں کا وقت نہیں۔ یہ پہلے سوچنے کی بات تھی۔" اس نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "آخر ہوا کیا ہے تمہیں؟"

لاجونتی نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ راگھو داس کچھ دور بینچ پر سر جھکائے بیٹھا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ کہیں اس نے کرنل کو اس کے جوتوں کے بارے میں بتا تو نہیں دیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کاٹیج میں چلی گئی۔ مگر وہاں اندھیرا اور سناٹا تھا اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ اپنی تنہائی میں' اپنے تصور کی خوب صورت دنیا میں پناہ لینا چاہتی تھی۔ اپنے خیالات ٹٹولنے کے خواہاں متجسس پتی سے دور۔ اس نے جسم پر شال لپیٹی' کاٹیج سے نکلی اور باغ کی طرف جانے والے راستے پر چل دی۔

کرنل حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ بہت سنبھل کر دھیرے دھیرے قدم اٹھا رہی تھی۔ سامنے اسکول ماسٹر کے باغیچے میں روشنی تھی۔ وہ لوگ باہر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے بولنے کی آوازیں اور برتنوں کی کھنک بہت دھیمی سی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ راستے سے ہٹی اور ناشپاتی کے درختوں کی طرف چل دی۔ راستہ اس کے لئے جانا پہچانا تھا۔

ذرا دیر بعد لیموں کے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔

زمین پر اسے کوئی سفید سی چیز دکھائی دی۔ اس نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ وہ اخبار کا ٹکڑا تھا جو اس نے اسی سہ پہر وہاں پھینکا تھا۔ اس پر مرغی کی چند چھوٹی ہڈیاں اب بھی چپکی ہوئی تھیں۔ اس اخبار کو بچھا کر اس نے اور سجاد نے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ وہ وہیں بیٹھ گئی' جہاں سہ پہر کو سجاد کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے سامنے کی مسکی ہوئی گھاس پر ہاتھ پھیرا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سجاد بیٹھا تھا۔ اس جگہ کو ہاتھ سے سہلاتے ہوئے اس کا جسم مرتعش ہو گیا۔ اس کے وجود میں عجیب سی حساسیت جاگ اٹھی۔ اسے لگا کہ سجاد وہاں موجود ہے اور وہ اس کی ہتھیلیوں کو سہلا رہی ہے۔ اندھیرے کے باوجود سارا گرد و پیش اس پر روشن ہو گیا۔ وہ اردگرد کی ہر چیز کو واضح طور پر محسوس کر سکتی تھی۔ درختوں کے خاکے' لیموں کے بڑے بڑے پتے' گھاس' ناشپاتی کے درخت' جھاڑیاں.......... وہ اس زمین کے چپے چپے کو محسوس کر سکتی تھی۔ تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جس نے

اسے ناقابلِ بیاں اور بے اندازہ خوشیوں سے نوازا تھا۔

اسے سہ پہر کی ایک بات یاد آئی۔ اس نے سجاد سے کہا تھا: "مجھے کہیں دور لے چلو پریتم۔ میں ساری عمر تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ کسی خوف، کسی دھڑکے کے بغیر۔"

سجاد نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"کوئی جگہ بھی یہاں سے دور نہیں لاج۔ تمہارے پتی کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔" اس نے کہا۔ "اور جب تک کشمیر کشمیریوں کو نہیں ملتا، خوف اور دھڑکے سے نجات بھی نہیں مل سکتی۔"

وہ اداس ہو گئی۔ "یہ تو بہت دور کی بات ہے۔ بے کار آس لگانے سے فائدہ؟ پھر مجھے کیوں ترساتے ہو۔ مجھے وہ سب کچھ دے دو، جو میں چاہتی ہوں۔"

"نہیں لاج۔ میں مسلمان ہوں، شادی کے بغیر تمہارے اتنا قریب نہیں آ سکتا.........."

"تو کیا ہم کم قریب ہیں؟"

"یقین کرو، یہ میں محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گیا ہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ یہ اتنی قربت بھی بہت بڑا گناہ ہے۔"

لاجونتی بجھ گئی۔ "تو کیا میں محروم ہی مروں گی؟"

سجاد نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔ "انشاء اللہ ایسا نہیں ہو گا۔" اس نے بے حد یقین سے کہا پھر پوچھا۔ "مذہب چھوڑ سکتی ہو نا میرے لئے؟"

"کہو تو دنیا بھی چھوڑ دوں۔"

"بس تو پھر یقین رکھو۔ جس دن میں کیمپ سے جاؤں گا، اس کے تیسرے دن تمہیں لینے کے لئے آؤں گا۔ اپنے گاؤں لے جا کر تم سے شادی کروں گا۔"

"میری سمجھ ایک بات نہیں آتی پریتم۔" لاجونتی بولی۔ "تم اتنے آزاد ہو کہ یہاں تک آ سکتے ہو تو کیمپ سے فرار کیوں نہیں ہو سکتے؟"

"بعض زنجیریں نظر نہیں آتیں لاج۔" سجاد نے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا پھر مسکرا دیا تھا۔ "میں تمہاری وجہ سے نہیں بھاگتا۔ ورنہ کب کا نکل گیا ہوتا۔"

"اور بھاگے بغیر میں تمہیں ملوں گی نہیں۔" لاجونتی نے آزردگی سے کہا۔

"ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے۔ اور وقت اب زیادہ دور نہیں.........."

لاجونتی کو اس کے شوہر کی پکار لیموں کے درخت اور محبت کے طلسم سے باہر کھینچ لائی۔ "لاجو.......... کہاں ہو تم لاجو؟" وہ پکار رہا تھا۔ لاجونتی کو اس کے لہجے میں برہمی بھی محسوس ہوئی اور تشویش بھی۔

لاجونتی نے جواب نہیں دیا۔ وہ گنگ بیٹھی رہی۔ کرنل نے اسے پھر پکارا۔ اس بار وہ ہچکچاتے ہوئے اٹھی اور اس کی آواز کی سمت بڑھی۔ اس کے اعصاب کھنچنے لگے تھے۔ اسے ڈر تھا کہ اس کا راز کھل گیا ہے۔

"کہاں ہو تم؟" کرنل نے چیخ کر کہا۔ "مجھے کیوں نظر نہیں آ رہی ہو۔ کہاں ہو لاجو؟"

ان کے درمیان ناشپاتی کے درخت حائل تھے۔

"میں یہاں ہو۔" اس نے جواب دیا۔

مگر اب صورتِ حال یہ تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو تلاش کر رہے تھے۔ دونوں کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک لاجونتی دہشت زدہ ہو گئی۔ وہ ناشپاتی کے درختوں سے نکلی اور اس نے آواز دی۔ "میں یہاں ہوں سوامی۔"

اندھیرے میں ایک تاریک سایہ اس کی طرف بڑھ آیا۔ "لاجو! تم نے جواب کیوں نہیں دیا میری پکار کا؟" کرنل نے پوچھا۔

"میں چہل قدمی کے لئے نکلی تھی۔"

"میری سمجھ میں تمہارے موڈ نہیں آتے۔ ذرا سی بات پر اپ سیٹ ہو جاتی ہو۔" کرنل کے لہجے میں شکایت تھی لیکن ایک دبی دبی التجا بھی تھی۔ تاہم وہ ہمیشہ کی طرح الزام اسی کو دے رہا تھا۔ لاجونتی کو خوشی ہوئی کہ کم از کم اس بار اس کے پتی کا الزام درست ہے۔

"اندھیرے میں بھٹکتے پھرنے میں لطف ہے کیا؟" کرنل کہہ رہا تھا۔ "اور تم بغیر کسی بات کے ناراض ہو گئیں۔ چلو مان لیا کہ میری بڑھاپے والی بات یا کوئی اور بات تمہیں بری لگی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ تم پچھلے عرصے میں بہت بدل گئی ہو۔" اس نے لاجونتی کا ہاتھ

تھام لیا۔

"چھوڑو، اس بات کو رہنے دو۔" لاجونتی نے نرم لہجے میں کہا۔

"اگر تم کسی طرح مجھے سمجھا سکو..........."

"کیا سمجھاؤں؟"

"یہی کہ یہ تبدیلی کیسی ہے، اور لگتا ہے کہ تم اندر سے بند ہو گئی ہو۔ اتنی عجیب کیوں ہو گئی ہو تم؟"

"کچھ بھی نہیں۔ یہ تمہارا وہم ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"

لاجونتی نے فیصلہ کیا کہ محض دفاع کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ چنانچہ اس نے جوابی حملہ کیا۔ "حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بدلے تم ہو۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم مجھے نظر انداز کرتے ہو........... پریشان رہتے ہو۔ کئی کئی دن مجھ سے بات نہیں کرتے۔ میں تو وہی ہوں پہلے جیسی۔"

کرنل نے کراہنے والے انداز میں کہا۔ "تم نہیں جانتیں کہ میں کتنا پریشان ہوں۔ اتنی خراب صورتِ حال میں تمہیں مجھ سے خوش مزاجی کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ میں تو اپنے دل کا بوجھ کہیں ہلکا بھی نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کر سکتے۔ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں کیا۔"

"سرکاری مسائل پر میں تم سے بات نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں نہیں سمجھا سکتا کہ غیر ملکی ماہرین میرے لئے کیسے مسائل کھڑے کر رہے ہیں، اوپر والوں سے بات کروں تو جواب ملتا ہے........... ان کے ساتھ تعاون کرو۔ تم ان پر حکم نہیں چلا سکتے۔ اس پر صورتِ حال کی سنگینی..........."

"مجھے بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرو۔" لاجونتی نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "یہ روسی ماہرین کیوں آئے ہیں یہاں؟" وہ خوش تھی کہ اس کی تبدیلی کا معاملہ ٹل گیا ہے۔ کرنل نے ہچکچاتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چند لمحے وہ اپنے آپ سے لڑتا رہا۔ پھر بولا۔ "کسی کو بتانا نہیں لاجو۔ وہ غیر ملکی روسی نہیں بلکہ یہودی ہیں۔ اسرائیلی انٹیلی جنس سے تعلق ہے ان کا۔ اس لئے اس معاملے میں اتنی راز داری برتی جا رہی ہے۔"

اس انکشاف نے لاجونتی کو دہلا دیا۔ "ہے بھگوان، یہ کیا ہو رہا ہے؟" وہ بولی۔ "وہ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

کرنل تلخی سے مسکرایا۔ "بظاہر ان کا اور ہمارا ہدف ایک ہے۔ پاکستان کا ایٹمی پلانٹ۔ ہماری انٹیلی جنس آج تک اس کے متعلق معلوم نہیں کر سکی۔ اب اندازہ ہوتا ہے کہ ہم سے زیادہ اسرائیل پاکستان سے خوف زدہ ہے۔ یہ یہاں کہوٹہ کے سلسلے میں ہماری مدد کرنے آئے ہیں لیکن اصل میں انہیں اپنی فکر ہے۔ ان کی یہاں موجودگی نے میرے مسائل میں اضافہ کر دیا ہے جو ویسے ہی بڑھ رہے ہیں۔"

"مگر یہاں ان کی موجودگی تو غلط..........."

"یہ اوپر والے جانیں۔" کرنل نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "میں فوجی ہوں۔ میرا کام تو احکامات کی بجا آوری ہے۔ میں نے اوپر رپورٹ کر دی ہے کہ اسرائیلی کشمیری مسلمانوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ انہیں احساس دلاتے ہیں کہ ان کے ساتھ انسانوں کا سا نہیں، جانوروں کا سا سلوک ہو رہا ہے۔"

"اور یہ سچ ہے۔" لاجونتی نے سفاک لہجے میں کہا۔

کرنل جھنجلا گیا۔ "اب تم سے کیا بات کروں، کیا دل کا بوجھ ہلکا کروں۔ بہرکیف مجھے کہوٹہ سے غرض نہیں۔ میں تو کشمیری مسلوں کی اس تنظیم کو کچل دینا چاہتا ہوں، جو یہاں زیرِ زمیں ابھر رہی ہے۔ میں یہاں برپا ہونے والی شورش کو پہلے ہی فرو کر دینا چاہتا ہوں۔"

"تو کچھ معلوم بھی ہوا اس بارے میں؟"

"میرا خیال ہے، دو چار دن بعد ہم ان پر ضرب لگا سکیں گے۔" کرنل نے کہا۔ "آؤ اب چلیں۔"

لاجونتی پھر اندیشوں میں گھر گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جو کچھ بھی ہو اس کے سجاد کے ساتھ نکل جانے کے بعد ہو۔ اب وہ اپنے پتی کے ساتھ ایک منٹ بھی نہیں گزارنا چاہتی تھی لیکن صورتِ حال کچھ اور کہہ رہی تھی۔ اس کا وجود مستقبل کے خوف سے بھر گیا۔

اس رات وہ دیر تک جاگتی رہی لیکن اس نے نیچی چھت والے اس کمرے کی

طرف سے آنکھیں بند کرلی تھیں اور سوچ رہی تھی کہ کاش آنکھوں کی طرح کان بھی بند کئے جاسکتے تو وہ اپنے پتی کے خراٹوں سے محفوظ رہ سکتی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے لئے زندگی ہے تو بس یہی ہے۔ تنہا' ویران اور خالی زندگی.......... کھوکھلی زندگی' تنگی دیواروں کے اس پنجرے میں گزرنے والی زندگی۔ ازدواجی زندگی کی ناخوش گوار یادوں نے اس کے ذہن کا گھیراؤ کرلیا تھا۔ اس نے گھبرا کر سجاد کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی۔ وہی اسے اس اذیت دہ ماضی سے بچا سکتا تھا۔ سجاد کے بارے میں سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

☆=====☆=====☆

اگست اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ کرنل کی پریشانی اور بدمزاجی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ گھر واپس آتا تو غصے میں ہوتا۔ اپنے ساتھ لائے ہوئے اخبار پر وہ ایک نظر ڈالتا اور پھر اسے ایک طرف پھینک دیتا۔ انٹیلی جنس والے کچھ اچھی خبریں فراہم نہیں کر رہے تھے۔ کشمیری لڑاکوں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ صورتِ حال واضح طور پر ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ فوج کی مدد کے باوجود سول انتظامیہ امن و امان کی صورتِ حال پر قابو نہیں رکھ پا رہی تھی۔ غذائی اجناس کی قلت الگ مسائل پیدا کر رہی تھی' اس کے نتیجے میں مہنگائی بڑھ رہی تھی۔

کرنل اجیت مزاج کا ویسے ہی سخت تھا۔ مگر اب وہ سختی بے رحمی کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ کشمیری مسلمانوں سے اس کی نفرت بھی انتہائی حدوں کو چھو رہی تھی۔ وہ نفرت اس لئے بھی بڑھ رہی تھی کہ اب کشمیری مسلمانوں کے.......... بلکہ کیمپ میں موجود بیگاریوں کے چہروں پر بھی امید اور خوشی نظر آتی تھی۔ اس بات سے کرنل اور چڑ جاتا۔ اس نے ان کے لئے بیگار بڑھا دی۔ پہاڑی سڑکوں کی مرمت کا اضافی کام بھی انہیں سونپ دیا۔

یہ وہ عرصہ تھا جس میں پھلوں کی اور لکڑی کی چوری چکاری بڑھ گئی۔ ضرورت ہر خوف پر حاوی آجاتی ہے۔ ایک رات کرنل کے باغ میں چوری ہوئی۔ صبح اردلی نے دیکھا کہ گھنٹی سے منسلک تار ٹوٹا ہوا ہے۔ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ کرنل کو بتائے لیکن کرنل نے خود باغ میں جاکر دیکھ لیا۔ اگلے روز وہ اپنے شہر والے مکان جاکر وہاں سے شکار والی

رائفل لے آیا۔

"اب تم کسی کو باغ میں گھستے دیکھو تو بغیر وارننگ کے شوٹ کردو۔" اس نے اردلی کو رائفل دیتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد جو ہوگا میں دیکھ لوں گا۔"

اس کے بعد اردلی نے شفتالو کے ایک پیڑ کے نیچے ڈیرہ جما لیا۔ وہ ہر رات وہیں سوتا' بھری ہوئی رائفل اس کے سرہانے رکھی ہوتی۔

پورے گاؤں میں شاید لاجونتی ہی تھی جو اپنے ہوش و حواس میں تھی۔ وہ بیک وقت دو دنیاؤں میں رہ رہی تھی۔ خواب کی دنیا اور حقیقت کی دنیا۔ وہ محبت کے سحر میں جی رہی تھی۔ ایسے میں آدمی گرد و پیش سے بے نیاز ہو جاتا ہے لیکن وہ سنگلاخ حقیقتوں کی دنیا سے بے خبر بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ کرنل کا لایا ہوا اخبار بڑے غور سے پڑھتی۔ کرنل کی باتیں بہت توجہ سے سنتی۔ اس کے بعد صورتِ حال کو بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کرتی۔ اس لئے کہ وہ زندہ رہنا چاہتی تھی اور اس نے جان لیا تھا کہ اس کے لئے زندگی ہے تو بس محبوب کی بانہوں میں ہے۔ وہ بس اس کے ساتھ کہیں نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ ساتھ ہوتا تو اس کی آتما شانت رہتی۔ اس کی خود اعتمادی لوٹ آتی لیکن خواب جیسی وہ زندگی بھی نامکمل تھی اور وہ تکمیل چاہتی تھی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سجاد نہ آپاتا۔ ایسے میں اس کا عجیب حال ہوتا۔ وہ پریشان' خوف زدہ اور غائب دماغ رہتی۔ اسے ڈر لگتا کہ کہیں سجاد کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ ممکن ہے اردلی نے کرنل کو جوتوں کے بارے میں بتا دیا ہو اور کرنل کو سجاد کے بارے میں معلوم ہو گیا ہو اور.......... بس وہ سوچتی اور دہلتی رہتی۔ وقت اس سے کاٹے نہ کٹتا۔ نامکمل سہی' لیکن وہ اس قربت کی عادی ہو گئی تھی۔ جیسے وہ کوئی نشہ ہو۔ شام ہوتے ہوتے اس کی تڑپ بڑھ جاتی۔ اس رات وہ ٹھیک سے سو بھی نہ پاتی۔ ہر طرح کے اندیشے اسے ستاتے رہتے۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا کہ وہ مرجائے گی۔

ایک بار سجاد مسلسل پانچ دن تک نہیں آیا۔ لاجونتی ہر روز مقررہ وقت پر لیموں کے درخت کے نیچے اس کا انتظار کرتی۔ اس کے کان پرندوں کی سی وہ مخصوص آواز سننے کو ترستے' جو سجاد کی آمد کا اشارہ تھی لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ تنہا بیٹھی رہتی' صرف اس کا سایہ ساتھ ہوتا۔ وہ بار بار باڑھ کے پاس جاتی اور اس راستے کو دیکھتی جس سے گزر کر

قیدی کیمپ کی طرف جاتے تھے مگر راستہ سنسان ہوتا............ سنسان رہتا۔

سجاد سے ملنے............ اسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش اتنا زور پکڑ گئی کہ اس کے لئے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ سجاد کے جانے کا وقت گزر جاتا تو وہ امید چھوڑ بیٹھتی کہ اب اس کے آنے کا سوال ہی نہیں مگر اس کے باوجود بھی ناشپاتی کے چھوٹے سے جنگل میں بھٹکتی پھرتی۔ لیموں کے درخت اور کاٹیج کے درمیان چکر لگاتی۔ ہر شام وہ اسکول ماسٹر گنگا دھر کے گھر ضرور جاتی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ قیدی بیگاریوں کی گزرگاہ اس کے گھر کے سامنے اور کافی قریب تھی۔ وہاں سے وہ کیمپ واپس جانے والے قیدیوں کو دیکھتی۔ ان کے فاقہ زدہ ستے ہوئے چہروں کو دیکھ کر اس کی طبیعت بگڑنے لگتی لیکن ان کے گزرتے ہی وہ انہیں بھول جاتی۔ اسے تو بس ایک چہرے کی تلاش تھی۔ اپنے محبوب کے چہرے کی۔ اس کے سوا اسے کچھ یاد نہیں تھا۔

اسکول ماسٹر کے گھر سے وہ بہت مایوس اور دل گرفتہ نکلتی۔ خاموشی اس کے اندر تک اتر گئی ہوتی۔ اس کا بولنے کو جی ہی نہ چاہتا۔ رات کو وہ بینچ پر بیٹھ کر افق سے ابھرتے وہ چاند کو تکتی رہتی۔ وہ خود کو سمجھاتی لیکن خوف اسے چاٹتا رہتا۔ اس خوف کی بے شمار شکلیں تھیں۔ کہیں سجاد کو شوٹ تو نہیں کر دیا گیا؟ کہیں اسے وبائی بیماری تو نہیں ہو گئی؟ وہ خود کو سمجھاتی کہ ممکن ہے سجاد کو کسی اور جگہ کام کرنے بھیج دیا گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ جس یہودی کے ساتھ اس کی ڈیوٹی ہے وہ بیمار ہو گیا ہو۔ ظاہر ہے ایسے میں وہ اسے چھوڑ کر آ تو نہیں سکتا۔

اور جب یہ سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو جاتا تو وہ اٹھ کر لیموں کے درخت کی طرف چل دیتی۔

پھر جو کچھ بھی ہوا بہت تیزی سے ہوا۔

سجاد کو غائب ہوئے چار دن ہو چکے تھے۔ لاجونتی کی تڑپ انتہا کو پہنچ گئی تھی لیکن وہ بہت بے بس تھی۔ کئی بار اسے خیال آیا کہ راگھو داس کو کیمپ بھیج کر سجاد کے بارے میں معلوم کرائے۔ کئی بار وہ کرنل سے اس کے بارے میں پوچھتے پوچھتے رہ گئی۔ صرف اس خیال سے کہ یہ سجاد کی موت کے پروانے پر دستخط کرنے کے مترادف تھا۔ وہ بڑی گھٹن محسوس کر رہی تھی۔

اس روز کرنل دوپہر کا کھانا کھانے آیا تو خلافِ معمول بہت خوش نظر آ رہا تھا لیکن لاجونتی کو بالکل احساس نہ ہوا۔ وہ تو اپنی ہی الجھنوں میں گھری ہوئی تھی۔

"لاؤ لاجو' کھانا دو جلدی سے۔ آج کئی دن بعد صحیح معنوں میں بھوک لگی ہے۔" کرنل نے چہک کر کہا۔

کرنل کے لہجے کی چہکار نے لاجونتی کو چونکا دیا۔ اس نے سر اٹھا کر پتی کو دیکھا اور پہلی بار اسے وہ تبدیلی نظر آئی تاہم کچھ پوچھنے کے بجائے وہ کھانا لگانے میں مصروف ہو گئی۔ وہ کھانا کھانے بیٹھے تو لاجونتی نے کہا۔ "کیا بات ہے؟ بہت خوش نظر آ رہے ہو؟"

"ہاں خوش تو ہوں۔ اتنے عرصے کے بعد آج کوئی اچھی خبر ملی ہے۔" کرنل نے کہا۔

"کیسی خبر؟"

"کشمیری مُسلوں کی خفیہ تنظیم کے بارے میں۔"

"کچھ معلوم ہوا ہے؟"

"معلوم کیا ہوا ہے' ان کے کریا کرم کا سامان ہو گیا ہے۔" کرنل کی خوشی ہیجان کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ "آخر کار انٹیلی جنس والوں نے کام کر دکھایا۔ آئندہ شکروار کو اس تنظیم کی ایک اہم میٹنگ ہو رہی ہے جس میں کشمیر میں بدامنی اور بغاوت پھیلانے کی تفصیلات طے ہوں گی۔ پروگرام کے تحت پہلے کچھ کارروائیاں ہوں گی اس کے بعد کشمیری مُسلوں کو مظاہروں اور ہڑتالوں پر اکسایا جائے گا۔"

"تو اس میں خوش ہونے کی کون سی بات ہے!؟"

"بے وقوف۔ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" کرنل کی جھنجلاہٹ میں بھی محبت تھی۔ وہ اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی ناسمجھ بچی ہو۔ "ہمیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ میٹنگ کہاں اور کس وقت ہو گی۔ یعنی وہ ان تخریب کاروں کی زندگی کی آخری رات ہو گی۔"

"اوہ!" اب بات لاجونتی کی سمجھ میں آئی۔ "اور وہ معراج میر............؟"

"اس کے متعلق ہم اب بھی اندھیرے میں ہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہو گا اور یہ بھی طے ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں بچ سکے گا۔ یوں یہ تنظیم اپنی موت آپ مر جائے گی۔ عام لوگوں کو سیدھا کرنا ہمارے لئے کچھ مشکل

نہیں۔"

"اور وہ تمہارے یہودی دوست کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ میرے دوست نہیں۔" کرنل نے چڑ کر کہا۔ "البتہ مُسلوں کے دشمن ہونے کے ناتے وہ میرے شریک ضرور ہیں......... حلیف کہہ لو۔ وہ اپنا کام کر رہے ہیں اور میں ان سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہیں کرتا۔"

لاجونتی کو گھبراہٹ ہونے لگی جانے کیوں' اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس معاملے کا تعلق اس کے محبوب سجاد سے ضرور ہے۔ کرنل کے جانے کے بعد وہ دیر تک سوچتی رہی۔ عقل اسے سمجھا رہی تھی کہ سجاد جیسے بیگاری کا تعلق کشمیری حُریت پسندوں کی تنظیم سے نہیں ہو سکتا۔ وہ محض اس لئے گھبرا رہی ہے کہ سجاد چار دن سے اس سے ملنے نہیں آیا ہے اور وہ اس کے متعلق اندھیرے میں ہے لیکن دل کی گھبراہٹ عقل کی تسلی سے بھی دور نہیں ہوئی۔

اس نے سوچا' آج شاید سجاد آ جائے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وقت اس سے کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جمنا کے جانے کے بعد وہ باغ کی طرف چلی گئی۔ راگھو داس پانی کے لئے نکل گیا تھا۔ وہ لیموں کے درخت کے نیچے جا بیٹھی لیکن گھبراہٹ نے اسے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ اضطراب کے عالم میں ٹہلتی......... کبھی بیٹھ جاتی۔

وقت گزرتا گیا' سائے لمبے ہوئے گئے لیکن سجاد نہیں آیا۔ اذیت کی ایک اور سہ پہر گزر گئی۔ راگھو داس کی واپسی کا وقت ہو چکا تھا۔ اب سجاد کی آمد کا کوئی امکان نہیں تھا اور اب وہ آ بھی جاتا تو کچھ فائدہ نہیں تھا۔ وہ مل نہیں سکتے تھے۔

اسے سجاد سے ملے پانچ دن ہو چکے تھے۔

اس رات کھانے کے بعد کرنل' اردلی راگھو داس کو ہدایات دیتا رہا۔ "شکروار کی رات میں گھر پر نہیں ہوں گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "تمہیں بیگم جی کا خیال رکھنا ہو گا۔ میری واپسی شاید صبح تک ہو گی۔"

راگھو داس معمول کے مطابق خاموشی سے ہر بات سنتا اور ذہن نشیں کرتا رہا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اسے پانچ دن پہلے یہ ہدایات کیوں دی جا رہی ہے۔

کرنل نے خود ہی وضاحت کر دی۔ "اس سے پہلے میں بہت مصروف رہوں گا۔

رات کو گھر واپسی کا بھی کوئی وقت نہیں ہو گا اور میں دوپہر کو بھی گھر نہیں آؤں گا۔ کھانا کسی کو بھیج کر منگوا لوں گا۔"

راگھو داس سر کو تفہیمی جنبش دے کر رہ گیا۔

"اتنی مصروفیت کیسی؟" لاجونتی نے مداخلت کی۔ حالانکہ وہ اس وقت بولنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"اس آپریشن کی پوری پلاننگ کرنی ہے مجھے جس کے متعلق تمہیں بتایا تھا۔"

لفظ آپریشن سن کر لاجونتی کا دل اور ہولنے لگا۔ حالانکہ وہ اس آپریشن کا سجاد سے تعلق سمجھنے سے قاصر تھی۔

اُس رات وہ ایک پل بھی نہ سو سکی۔

☆=====☆=====☆

اگلے روز کرنل دوپہر کے کھانے کے لئے نہیں آیا۔ ایک فوجی آیا تھا۔ لاجونتی نے اس کے ہاتھ کھانا بھجوا دیا۔ اسے یقین تھا کہ آج سجاد ضرور آئے گا۔ راگھو داس کے جانے کے بعد وہ جمنا کے رخصت ہونے کا انتظار کرتی رہی۔

جمنا کے جاتے ہی وہ باغ کی طرف لپکی۔ وہ لیموں کے درخت تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ اسے پرندوں کی سی مخصوص چہکار سنائی دی۔ اس نے چونک کر اس طرف دیکھا' جہاں باڑھ کے درمیان تار موڑ کر اس نے سجاد کے لئے جگہ بنائی تھی۔ مگر باڑھ اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ سامنے کے گھنے درختوں نے اسے چھپا لیا تھا۔ ذرا دیر بعد ان درختوں کے پیچھے سے سجاد نمودار ہوا۔

اسے دیکھتے ہی ضبط کے' حیا کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ اس کی طرف یوں لپکی کہ پہلے کبھی نہیں لپکی تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ اس سے لپٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے حلق سے بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں۔ پھر وہ بھی معدوم ہو گئیں۔ اس نے جان لیا کہ ایسے میں کچھ کہنے کی کوشش لاحاصل ہے۔ سجاد بوکھلایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس کی پیٹھ تھپکتا رہا۔

پانچ دن کا طوفان گزرنے میں کچھ دیر لگی لیکن آخر کار وہ گزر گیا۔ لاجونتی کی سسکیاں تھمیں اور وہ پُرسکون ہو گئی۔ مگر وہ سجاد سے ویسے ہی لپٹی کھڑی رہی۔ اس کی

سانسوں کی لے بھی اب دھیمی ہو چلی تھی۔

سجاد نے چاہا کہ اسے ذرا سا پیچھے ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھے لیکن وہ اس سے بری طرح لپٹی ہوئی تھی۔ "نہیں سجاد نہیں" وہ گڑگڑائی۔ "میں اب تم سے دور نہیں رہوں گی۔ ورنہ تم پھر مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔" اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"سنو تو لاج، مجھے اپنی صورت تو دیکھنے.........."

"کہاں تھے تم اتنے دنوں سے۔ تمہیں میں یاد بھی نہیں آئی؟" لاجونتی کے لہجے میں شکایت تھی۔

"میں مجبور تھا لاج۔ ورنہ میں تم سے دور رہ سکتا ہوں؟"

"تمہیں نہیں معلوم، مجھ پر کیا گزری ہے۔ میں کتنی خوف زدہ رہی ہوں۔"

"اب تو میں آ گیا ہوں نا۔" سجاد نے اسے چمکارا۔ "آؤ سکون سے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔"

وہ دونوں لیموں کے درخت کے نیچے آ بیٹھے۔ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر لاجونتی بولی۔ "میں اب تمہارے بنا نہیں رہ سکتی پریتم۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں لاج۔ وقت آ گیا ہے کہ ہماری کہانی یا ایک نیا موڑ لے یا ختم ہو جائے۔" سجاد نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"یہ بتاؤ، تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟"

"دل و جاں سے۔"

"میرا مذہب بھی دل سے اپنا سکو گی؟"

"کیوں نہیں۔"

"وعدہ کرو کہ اس لمحے سے تم میری ہو.......... صرف میری۔"

"میں تو جب سے تم سے ملی ہوں، صرف تمہاری ہوں پریتم۔"

"پھر بھی وعدہ کرو۔ تم نہیں سمجھو گی لیکن یہ بہت ضروری ہے۔"

لاجونتی نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "تمہاری قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس لمحے سے میں صرف تمہاری ہوں۔"

"تو سنو۔ میں تمہیں سب کچھ نہیں بتا سکتا۔ بس اتنا جان لو کہ میں سر سے کفن باندھے پھرتا ہوں۔ میری زندگی میری نہیں.......... ایک عظیم مقصد کے لئے وقف ہے۔ میرے ساتھ تم کسی بھی وقت بیوہ.........."

لاجونتی نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بھگوان نہ کرے" پھر اداس لہجے میں بولی۔ "یہ جو زندگی میں بتا رہی ہوں، بیوگی سے زیادہ بدتر ہے لیکن پریتم، تم.........."

سجاد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جو کچھ میں بتا چکا ہوں، اس سے زیادہ فی الوقت نہیں بتا سکتا.......... تم پوچھنا بھی نہیں۔"

اس کے لہجے میں سختی سے بڑھ کر کوئی چیز تھی، جس نے لاجونتی کو مزید کچھ پوچھنے سے روک دیا۔ "ٹھیک ہے پریتم۔ میں تو خود کو تمہیں سونپ چکی ہوں۔" وہ بولی۔

"اب یہ بتاؤ، کب چلو گی میرے ساتھ۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

لاجونتی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ ایک یکسر بدلا ہوا آدمی لگ رہا تھا۔ انداز سے وہ بیگاری نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔

"تم نے جواب نہیں دیا لاج!"

وہ چونکی۔ "شکروار کی رات میرا پتی گھر پر نہیں ہو گا۔ تم سورج ڈھلے کسی بھی وقت آ جانا۔ میں تیار ملوں گی۔"

"تمہارا مطلب ہے، جمعے کی رات؟" سجاد کی رنگت متغیر ہو گئی۔

"ہاں پریتم۔"

"جمعے کی رات کرنل گھر پر موجود نہیں ہو گا؟ کیوں؟"

اس کے لہجے کی سنگینی محسوس کر کے لاجونتی نے سر اٹھایا اور اسے بغور دیکھا۔ اس کا چہرہ بدل گیا تھا۔ نرمی کی جگہ درشتی نے لے لی تھی۔ آنکھوں میں پریشانی تھی۔ "میں نے کہا تھا نا کہ تمہاری طرف سے.......... تمہارے نہ آنے سے خوف زدہ ہو گئی تھی۔" وہ بولی۔

"ہاں مجھے یاد ہے، تم نے آتے ہی یہ بات کہی تھی۔"

"میں اس لئے خوف زدہ تھی کہ مجھے ڈر تھا کہ تمہارا تعلق کشمیری لڑاکوں سے ہو

گا۔" یہ کہتے کہتے لاجونتی کو احساس ہو گیا کہ اس کا خوف بے وجہ نہیں تھا۔ اس نے ٹھیک سوچا تھا۔ سجاد نے اس کی تصدیق کر دی۔ اس کا چہرہ اچانک ہی پرسکون ہو گیا تھا۔

"تمہارا خیال درست تھا مگر مجھے کرنل کی جمعے کی مصروفیت کے بارے میں بتاؤ۔"

"کشمیری لڑاکوں کی کوئی خفیہ تنظیم ہے۔ اس کا ایک اہم رکن ہے معراج میر۔ بھارتی انٹیلی جنس عرصے سے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہی تھی.........."

وہ کہتی رہی اور وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی درمیان میں اسے نہیں ٹوکا۔

لاجونتی کو جو کچھ کرنل سے معلوم ہوا تھا' وہ اس نے سجاد کو بتا دیا۔ لاجونتی خاموش ہوئی تو سجاد نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "میں تمہارا شکر گزار رہوں لاج۔ تم نہیں جانتیں کہ تم نے کشمیر کو کتنا پیچھے جانے سے بچا لیا ہے۔ ہم کشمیریوں کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ ہماری منزل کتنی دور ہے۔ مگر ہمیں یہ یقین ہے کہ خدانخواستہ ہم منزل تک نہ پہنچ سکے تو ہمارے بعد والے انشاء اللہ ضرور پہنچیں گے۔"

"میں بھی کشمیریوں کو آزاد دیکھنا چاہتی ہوں۔" لاجونتی بولی۔ "لیکن سجاد.........."

"تم اب کچھ نہ کہو لاج۔" سجاد نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اب صرف میری سنو۔ میں نے تمہاری بے یقینی محسوس کر لی ہے۔ تم شاید یہ سمجھ رہی ہو کہ میں نے محبت کے نام پر تمہیں استعمال کیا ہے لیکن یقین کرو میں جو کچھ بھی کہوں گا سچ کہوں گا۔ اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہو گا۔"

لاجونتی ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں اور وہ کوئی جسمانی خوف نہیں تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اس کے خوابوں کا تاج محل چکنا چور ہونے والا ہے۔

"میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔" سجاد نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "میں کشمیری حریت پسندوں کی خفیہ تنظیم کا وہ اہم رکن ہوں' جس کے بارے میں جاننے کی بھارتی انٹیلی جنس سر توڑ کوشش کرتی رہی ہے۔ میں ہی معراج میر ہوں۔"

لاجونتی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "لیکن سجاد.........."

"سجاد میرا فرضی نام ہے۔ در حقیقت میں معراج میر ہوں۔"

"مگر تم نے مجھے حقیقت کیوں نہیں بتائی!" لاجونتی روہانسی ہو گئی۔ "تم جاسوسی کے لئے مجھ سے.........."

"پہلے میری بات سن لو۔ ایک ایسے کشمیری جوان نے' جو بیگار کیمپ میں رہ چکا تھا' مجھے بتایا تھا کہ یہاں غیر ملکی موجود ہیں۔ یہ بات ہمارے لئے تشویش کا باعث تھی اور حقیقت جاننا ہمارے لئے ضروری تھا۔ میں اس کوشش میں لگ گیا کہ کسی طرح یہاں کے بیگار کیمپ تک پہنچ جاؤں۔ مجھے اس میں کامیابی ہوئی اور میں سجاد کی حیثیت سے کیمپ میں آ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے خود اپنی آنکھوں سے غیر ملکیوں کو دیکھ لیا۔ اگلا مرحلہ سخت تھا۔ مجھے کسی طرح ان غیر ملکیوں کو متاثر کر کے ان سے قریب ہونا تھا۔ وہاں خوش قسمتی نے میرا ساتھ دیا۔ کچھ میرا تعلیم یافتہ ہونا میرے کام آیا۔ ان کے چیف نے خود مجھے طلب کیا لیکن اس قربت سے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ وہ لوگ بہت گہرے تھے۔ کافی دن ہو گئے اور مجھے اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے بارے میں روسی ہونے کا جو تاثر دیا جا رہا تھا' غلط تھا۔ وہ روسی ہرگز نہیں تھے۔ مگر صرف اتنا جاننا کافی نہیں تھا۔ ہمیں تو یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ در حقیقت کون ہیں اور کشمیر میں ان کی موجودگی کا کیا مقصد ہے۔

"اب مجھے سوچنا پڑا کہ کوئی اور راہ تلاش کی جائے۔ پہلے میں باہر بیگار کرتا تھا اور سامنے والے راستے سے کیمپ واپس چلا جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ کیمپ کمانڈنٹ کا کاٹیج ہے۔ یہ طے تھا کہ کیمپ کمانڈنٹ کو ان غیر ملکیوں کی حقیقت معلوم ہو گی۔ یہاں مجھے ایک امکان نظر آیا۔ میں نے سوچا' ممکن ہے کرنل اپنی بیوی سے سرکاری' دفتری باتیں کرتا ہو۔ یہ ضروری نہیں تھا مگر واحد امکان تھا اور میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس دن میں نے یہاں کا رخ کیا' سوچے سمجھے منصوبے کے تحت.........."

"اور اس کے لئے تم نے مجھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا؟" لاجونتی نے تلخی سے کہا۔

"خاموش رہ کر میری بات سنو۔" معراج میر نے اسے ڈانٹ دیا۔ "میں نے مجبور ہو کر وہ فیصلہ کیا تھا اور یہ بھی سن لو کہ ہم مسلمان یہ مزاج نہیں رکھتے کہ عورتوں کو اس طرح استعمال کریں۔ ہمارے لئے یہ شرمندگی کا مقام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں پہلی

بار یہاں نیم دلی سے آیا تھا۔ میں خود کو بار بار یاد دلا رہا تھا کہ یہ قومی سلامتی کا معاملہ ہے اور قوم کی سلامتی یقینی طور پر اصولوں سے بڑی ہوتی ہے۔ جنگ برابر کی ہوتی تو میں کبھی ایسا نہ کرتا لیکن تم کیا جانو کہ بھارتی وسائل کے سامنے ہم بے وسیلہ کشمیری چیونٹی جتنی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ مگر جب میں نے تمہیں دیکھا.........." اس کا لہجہ اچانک نرم ہو گیا۔ "تو میں پہلی نظر میں ہی ہار گیا۔ میں نے جان لیا کہ میں تمہیں استعمال نہیں کر سکتا۔ ایک تو یہ کہ میں نسبتاً زیادہ عمر کی، کسی بھدی اور خرانٹ عورت کی توقع کر رہا تھا۔ جبکہ تم مجھے کشمیریوں کی طرح مظلوم لگیں اور اس پر ستم یہ ہوا کہ میں پہلی نظر میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا۔"

لاجونتی کی سانسیں رکنے لگیں۔ "سچ کہہ رہے ہو؟" اس نے ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

"میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ صرف سچ بولوں گا اور یہ بھی سن لو کہ وہ میرے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں تھی۔ میں ایک مجاہد ہوں، میرا راستہ شہادت کا راستہ ہے۔ ایسے لوگ محبت کے راہی نہیں ہوتے اگر میرے اختیار کی بات ہوتی تو میں ہرگز محبت نہ کرتا لیکن یہ تو وہ جذبہ ہے جو آدمی کو بے بس کر دیتا ہے۔ اب یہ ممکن نہیں تھا کہ میں تم سے محبت بھی کروں اور تمہیں استعمال بھی کروں۔ چنانچہ میں محبت سے لڑتا.......... انکار کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی بار کے بعد ایک ہفتے تک میں نے تمہارے گھر کا رخ نہیں کیا۔ میں خود کو سمجھاتا رہا کہ میں ایک مجاہد ہوں۔ میرے سامنے ایک عظیم مقصد ہے۔ محبت تو میرے لئے راستہ کھوٹا کرنے والی چیز ہے لیکن میں محبت سے ہار گیا۔ دوسری بار میں تمہارے پاس آیا تو ہار چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے صرف تم سے محبت کی۔ غیر ملکیوں کے بارے میں معلومات میں نے اپنے طور پر حاصل کیں۔ آج میرا مشن پورا ہو گیا۔ میں پچھلے پانچ دن سے اسی چکر میں لگا ہوا تھا۔ اسی لئے تم سے ملنے نہیں آ سکا اور اب تمہیں لینے آیا تھا۔ اب مجھے کیمپ میں بیگار کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ غیر ملکی یہودی ہیں اور پاکستان کا ایٹمی پلانٹ ان کا ہدف ہے۔ میری پہلی ترجیح ان یہودیوں کو نیست و نابود کرنا ہے۔"

"لیکن کیوں؟ تمہارا مقصد تو آزادیٔ کشمیر ہے۔"

"تم نہیں سمجھو گی، پاکستان ہماری اساس ہے۔"

"اب کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"پہلے تم بتاؤ۔ اپنے وعدے پر قائم ہو؟"

"وہ وعدہ تو ہر حال میں پورا ہو گا۔"

"تو سنو۔ ہمیں اپنی تنظیم کے وجود کا اعلان کرنے کا بہت اچھا موقع ملا ہے۔ اب ہماری خفیہ میٹنگ استقبالیہ کمیٹی میں تبدیل ہو جائے گی اور تنظیم کا خاتمہ کرنے کی نیت سے آنے والوں میں سے کوئی زندہ نہیں بچے گا اور اس کے ساتھ ہی کشمیر کی آزادی کے لئے کشمیریوں کی اس جدوجہد کا آغاز ہو گا جو انشاء اللہ آزادی تک جاری رہے گا۔"

"اور میرا پتی بھی مارا جائے گا؟" لاجونتی کا لہجہ کچھ عجیب سا تھا۔

"تمہیں افسوس ہو گا؟"

"اس سلسلے میں مجھے یہ خلش بہرحال رہے گی کہ وہ میری زبان کھلنے کی وجہ سے مارا گیا۔"

معراج میر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ذرا دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور لاجونتی کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی خلش ہمیشہ تمہارے ساتھ.......... تمہارے میرے درمیان رہے۔" اس نے کہا۔ "اور میں اپنے ساتھیوں کی قربانی بھی نہیں دے سکتا۔ البتہ میں جو کچھ کر سکتا ہوں، ضرور کروں گا۔ میرا ارادہ تھا کہ آج کیمپ واپس نہیں جاؤں گا لیکن اب میں نے ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ میں جمعے کی سہ پہر تک کیمپ میں ہی رہوں گا لیکن اب تم سے ملنے نہیں آؤں گا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنا ہے، جوابی منصوبہ بنانا ہے۔ اس کے لئے میرے پاس دن کا یہی وقت ہوتا ہے۔" اس نے ذرا توقف کیا اور ایک گہری سانس لی۔ "اس دوران تم اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ کرنے کے لئے آزاد ہو۔ تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے اس کی تلافی کرنل کو میرے متعلق بتا کے کر سکتی ہو۔ اس کے نتیجے میں کرنل اور اس کے [illegible] جان بچ جائے گی اور میں کرنل کا انعام ہوں گا۔ یوں تمہارے ضمیر پر بوجھ بھی [illegible] گا اور میری محبت کی سچائی بھی ثابت ہو جائے گی۔"

"مجھے اب تمہاری محبت کی سچائی پر کوئی شک نہیں۔"

"تم صرف میری بات غور سے سنو۔ درمیان میں فیصلے کے چار دن ہیں۔ ان چار

دنوں میں تمہیں آزادی سے سوچنا ہے۔ کشمیریوں کے کاز کے متعلق بھی سوچنا اور اپنے دھرم کی تعلیم پتی ورتا کے بارے میں بھی۔ اس کے بعد تم جو فیصلہ کرو گی' وہ سچا ہو گا۔ میں یہ خطرہ اس لئے بھی مول لے رہا ہوں کہ میں نہیں چاہتا' تم صرف میری محبت کی وجہ سے میرے ساتھ چلو۔ وہ نامکمل ساتھ ہو گا۔ پھر تم میرے پاس آؤ گی تو کوئی خلش کوئی بوجھ لے کر نہیں آؤ گی۔"

"کشمیر اور کشمیریوں کے بارے میں تو میں ہمیشہ سے سوچتی رہی ہوں۔" لاجونتی کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"صرف سوچتی رہی ہو نا اور وہ بھی سرسری انداز میں۔ اب اس سلسلے میں کچھ کرو گی یا اسے مسترد کر دو گی۔ یہ فیصلے کی گھڑی ہے۔"

"فیصلہ تو میں اس وقت بھی کر سکتی ہوں۔"

"میں ایسا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دل بن کر نہیں دماغ بن کر فیصلہ کرو۔ تمہارے فیصلے کا مجھے علم ہو جائے گا اگر میں زندہ ہوا تو جمعے کی آدھی رات کے بعد کسی وقت تمہیں لینے کے لئے آؤں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لاجونتی بھی بے تابانہ اٹھی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

"ذرا دیر تو رکو نا۔" اس نے التجا کی۔ "میں کب سے تمہیں دیکھنے کو ترس رہی تھی۔"

"صرف چار دن کی بات ہے لاج۔ پھر ہم ایک دوسرے کے ہوں گے۔ ان چار دنوں میں یہ یقین دہراتی رہنا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"تم ظلم کر رہے ہو.........."

"خدا حافظ لاج۔"

وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھتی رہی۔

☆=====☆=====☆

وہ چار دن کشمکش کے ہرگز نہیں تھے۔ فیصلہ تو لاجونتی کے اندر پہلے ہی سے موجود تھا۔ وہ لٹیروں کا ساتھ تو نہیں دے سکتی تھی۔ وہ تو لمحہ لمحہ جمعے کی رات کا انتظار کر رہی تھی.......... ملن کے وقت کا انتظار! وہ وقت خواب کی سی کیفیت میں گزرا۔ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ بس مشین کی طرح چل پھر رہی تھی وہ۔

کرنل نے اس کی وہ کیفیت محسوس کر لی۔ جمعے کی دوپہر کھانے کے دوران اس نے کہا۔ "تم عجیب سی ہو رہی ہو لاجو۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں' کچھ بھی تو نہیں۔"

میری طرف سے پریشان ہو.......... آپریشن کی وجہ سے؟"

"ممکن ہے' یہی بات ہو' کچھ طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"میری فکر نہ کرو' مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ ہاں ترقی ہو سکتی ہے میری۔"

لاجونتی ہوں ہاں کر کے رہ گئی۔

"میرا خیال ہے' مجھے گھر پہنچتے پہنچتے صبح ہی ہو جائے گی۔ میں نے راگھو داس کو کہہ دیا ہے' وہ تمہارا خیال رکھے گا۔"

"ٹھیک ہے جی۔"

شام آئی' سورج غروب ہوا اور رات ہو گئی۔ وہ انتظار لاجونتی کے اعصاب چٹخائے دے رہا تھا۔ اس نے راگھو داس کو کھانا دیا۔ خود اسے بھوک نہیں تھی۔ وہ برآمدے میں بیٹھی کتاب پڑھنے کی اداکاری کرتی رہی۔

"بیگم جی.......... آپ اندر سوئیں گی؟" راگھو داس نے آکر پوچھا۔

"ہاں راگھو' لیکن مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی ہے۔"

راگھو داس اپنا بستر بچھا آیا تھا۔ اس کی چارپائی شفتالو کے درخت کے نیچے بچھی ہوئی تھی لیکن لاجونتی کے جاگنے کا سن کر وہ برآمدے میں دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ لاجونتی نے سوچا اگر وہ برآمدے میں بیٹھی رہی تو راگھو داس بھی سونے کے لئے نہیں جائے گا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا' گیارہ بجنے والے تھے۔ اس نے کتاب بند کی اور جماہیاں لینے لگی۔ "راگھو.......... میں اب جا کر سوؤں گی۔"

"ٹھیک ہے بیگم جی۔ دروازہ اندر سے بند کر لیجئے گا۔ میں بھی چوکس سوؤں گا۔"

لاجونتی نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا اور بیڈ روم میں چلی گئی لیکن اس کا دھیان باہر اٹکا تھا۔ ایک طرف ملن کی آس تھی تو دوسری طرف اندیشے۔ اس کا محبوب کوئی عام آدمی نہیں' ایک کشمیری سرفروش تھا۔

وہ مجسم دعا بن گئی۔

بارہ بج کر دس منٹ پر فضا فائرنگ کی آوازوں سے گونج اٹھی اور وہ زیادہ دور کی آوازیں نہیں تھیں۔ وہ گھبرا کر اٹھی' دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی۔ باہر فائرنگ کی آوازیں اور نمایاں تھیں۔

لیکن فائرنگ جلد ہی تھم گئی۔ فضا پر سکوت طاری ہو گیا۔

وہ کچھ دیر برآمدے میں کرسی پر بیٹھی رہی۔ اب کسی بھی لمحے معراج میر آ سکتا تھا۔ اس کا دل اندیشوں کے بوجھ تلے لرز رہا تھا۔ وہ اعصاب شکن انتظار تھا۔

گھنٹی کی آواز نے بری طرح دہلا دیا۔

کوئی باڑھ پار کر کے باغ میں گھسا تھا اور وہ معراج میر کے سوا کون ہو سکتا تھا لیکن گھنٹی کی آواز! اس نے سوچا' معراج کو اس مخصوص جگہ سے اندر آنا چاہئے تھا۔

مگر اگلے ہی لمحے جس خیال نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا' وہ لرزہ خیز تھا۔ وہ لرز اٹھی۔ یہ خیال تو پہلے ہی اس کے ذہن میں آنا چاہئے تھا۔ اتنی اہم بات وہ کیسے بھول گئی اور اب.......... اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ معراج کو خبردار نہیں کر سکی تھی کہ راگھو داس سرہانے بھری ہوئی رائفل رکھ کر سوتا ہے اور کرنل نے اسے حکم دیا ہے کہ باغ میں گھسنے والوں کو بغیر کسی وارننگ کے شوٹ کر دے۔ یہ بھی اتنی اہم بات نہیں تھی بشرطیکہ خود اسے یہ بات یاد رہتی۔ وہ رائفل چھپا بھی سکتی تھی' خالی بھی کر سکتی تھی۔

مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ مضطرب ہو کر اٹھی اور باغ کی طرف جانے والے راستے پر لپکی۔ رات اندھیری تھی اور سناٹا اتنا گہرا تھا کہ باغ میں خاصا اندر چلنے والے کے قدموں کی چاپیں اسے سنائی دے رہی تھیں۔ پھر آہٹیں بڑھ گئیں۔ یقینی طور پر راگھو داس جاگ چکا تھا۔

وہ باغ کے اندر داخل ہونے والی تھی کہ اسے اچانک روشنی ہوتی نظر آئی۔ وہ ٹارچ کی روشنی تھی اور ٹارچ یقیناً راگھو داس کے ہاتھ میں تھی۔

"راگھو.......... گولی نہ چلانا۔ بھگوان کے لئے اسے شوٹ نہ کرنا۔" لاجونتی چلائی۔

ٹارچ بجھ چکی تھی۔ پھر کچھ نیچے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اندھیرے میں بھی جیسے سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ راگھو نے ٹارچ گرا دی تھی کیونکہ وہ پھل چور کی پوزیشن سمجھ چکا تھا۔ اب وہ شست باندھ رہا ہو گا۔

"راگھو.......... بھگوان کے لئے گولی نہ چلانا۔" اس بار وہ حلق کے بل چیخی۔

سناٹے میں رائفل کا ہیمر ہٹائے جانے کی آواز بہت واضح تھی۔

"بھاگو معراج!" لاجونتی چلائی۔ خود اس کا یہ حال تھا کہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی تھی۔ ہلنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس کی آواز کے ساتھ ہی بہت کچھ ہوا۔ قدموں کی چاپ بھاگتے قدموں کی آواز میں تبدیل ہوئی۔ ایک ہیولا سا اس کی طرف آتا محسوس ہوا۔ ساتھ ہی فائر کی آواز گونج۔ ایک انسانی چیخ ابھری اور دم توڑ گئی اور کوئی دھپ سے نیچے گرا۔

اس کے ساتھ ہی لاجونتی کا سحر زدہ جسم جیسے کسی بندش سے آزاد ہو گیا۔ وہ باغ میں داخل ہوئی اور لرزتی ٹانگوں کے باوجود اس طرف دوڑی جہاں اس نے اس ہیولے کو دیکھا تھا۔

وہ اور راگھو داس مختلف سمتوں سے بیک وقت زمین پر بے حس و حرکت پڑے جسم تک پہنچے۔ لاجونتی کے ہوش و حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ اسے بس یہ احساس تھا کہ اس کی دنیا تاریک ہو چکی ہے۔

راگھو داس کے کندھے سے رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ "آج آخر مارا گیا سُسرا۔"

لاجونتی گنگ تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ اندر سے مر چکی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی یہ کیسا ستم ہوا ہے' ملن کے اتنا قریب..........

راگھو داس نے ٹارچ کی روشنی بے حس و حرکت جسم پر ڈالی۔ "ارے بیگم جی' کرنل صاحب کے بوٹ!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس کے بعد کیا رکھا تھا۔ اس کے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اس نے راگھو داس کا گریبان تھام کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اس پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا سینہ پیٹ رہی تھی۔ "قاتل.......... ہتھیارے.......... میں نے کہا تھا کہ گولی نہ چلانا.......... قاتل ہتھیارے۔"

اسی وقت اطلاعی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی نے پکارا۔ "کرنل صاحب.......... کرنل صاحب.......... کیا ہوا' خیر تو ہے؟" وہ اسکول ماسٹر گنگا دھر کی آواز تھی۔

راگھو داس نے لاجونتی کو جھٹکا دیا' وہ نیچے گر گئی۔ راگھو داس گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

☆=====☆=====☆

"دروازہ راگھو داس نے کھولا تھا۔" گنگا دھر جی کہہ رہے تھے۔ "میں نے اس سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے.........."

"کچھ نہیں ماسٹر جی۔" وہ بولا۔ "ایک پھل چور نے بڑے دن سے پریشان کر رکھا تھا۔ کرنل صاحب کا حکم تھا کہ دیکھتے ہی گولی مار دی جائے۔ آج وہ میرے ہتھے چڑھ گیا۔ میں نے شوٹ کر دیا سالے کو۔"

"میں راگھو داس کے ساتھ اندر گیا۔ وہ مجھے باغ میں لے گیا۔ ٹارچ روشن کر کے اس نے مجھے لاش دکھائی۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ مرنے والے کے کپڑے دیہاتیوں کے سے تھے لیکن اس کے پیروں میں فوجی بوٹ تھے۔ مجھے خیال آیا کہ یہ وہی بیگاری نہ ہو جسے ایک روز لاجونتی نے پکڑا اور پھر ترس کھا کر کھانا کھلایا تھا۔ دونوں کے درمیان مجھے عجیب سا تعلق محسوس ہوتا تھا۔

"گولی مرنے والے کے سر کے پچھلے حصے میں لگی تھی اور وہ منہ کے بل گرا تھا۔ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں نے ہمت کر کے لاش کو سیدھا کیا۔ ٹارچ کی روشنی میں' میں نے دیکھا۔ وہ کوئی اور آدمی تھا۔

"میں نے راگھو داس سے پوچھا۔ "تمہاری مالکن کہاں ہے؟"

"میں یہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ ان کی طبیعت بگڑ رہی تھی' کاٹیج میں ہوں گی۔"

"ہم کاٹیج میں چلے گئے لیکن لاجونتی وہاں نہیں تھی۔ راگھو داس پریشان ہو گیا۔ بار بار کہتا تھا کہ کرنل صاحب اسے ذمے داری سونپ کر گئے ہیں۔ ہم نے باہر نکل کر اِدھر اُدھر ڈھونڈا۔ پھر باغ میں چلے گئے۔ مگر ہم لاجونتی تک پہنچے تو وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ شفتالو کے جس درخت کے نیچے راگھو داس کی چارپائی تھی' اس کی ایک شاخ سے اس نے خود کو پھانسی دے لی تھی۔" گنگا دھر جی نے جھرجھری سی لی۔ "وہ منظر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔"

"اور کرنل کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کشمیری لڑاکوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا کوئی فوجی بھی زندہ نہیں بچا تھا۔ پھر کشمیری لڑاکوں نے یہاں کیمپ پر حملہ کیا اور تمام غیر ملکیوں کو ختم کر دیا۔"

"لیکن اس رات معراج میر کیوں نہیں آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "اور جو باغ میں مارا گیا وہ کون تھا؟"

"یہ سب کچھ تو معراج میر ہی بتا سکتا ہے۔"

"وہ زندہ ہے؟"

"ہاں۔"

"مگر میں اس سے کہاں مل سکوں گا؟"

"کون جانے!" گنگا دھر جی نے کہا۔

☆=====☆=====☆

دوپہر کو میں پٹواری سے ملا۔ وہی پرانا پٹواری تھا۔ باپو کے زمانے کا۔ باپو کے حوالے سے اسے سب یاد آ گیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ میں نے اسے اس زمین کے بارے میں بتایا جو کرنل نے غصب کر لی تھی لیکن تھی ہماری۔

"کرنل کی زندگی میں تو وہ آپ کو مل نہیں سکتی تھی پرتاپ بابو۔ میں بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔" پٹواری نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "عدالت میں جانے سے بھی کچھ نہ ہوتا مگر اب تو کرنل کی اپنی زمین کا بھی کوئی وارث نہیں۔"

"پھر بھی آدمی بے ایمانی سے باز نہیں آتا۔"

"اب آپ کی زمین آپ کی ہے پرتاپ بابو۔ آپ بے فکر ہو کر قبضہ کر لیں۔" وہ بولا۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا۔ شام کو میں زمینوں پر چلا گیا۔ وہاں ایک بڑا کچا کمرا موجود تھا' جہاں چارپائی بھی تھی اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں بھی موجود تھیں۔ چائے کا سامان میں ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے چائے بنائی اور چارپائی باہر نکال لی۔

میں باہر بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ میں نے ایک شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ بے حد وجیہہ اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ وہ قریب آیا تو میں احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ پرتاپ سنگھ ہیں؟" اس نے گونج دار آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ آیئے تشریف رکھئے۔"

وہ بے تکلفی سے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"چائے پئیں گے؟"

"نہیں شکریہ۔ میں چائے نہیں پیتا۔"

"فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟"

"سنا ہے آپ زمین بیچ رہے ہیں اپنی۔"

"جی ہاں۔"

"وہ زمین تو نہیں بیچیں گے جس پر کرنل ہحیت نے قبضہ کر لیا تھا۔"

"اس کا تو ارادہ نہیں.........."

"میں اس کے لئے شکرگزار ہوں۔ دراصل مجھے معلوم ہے کہ آپ یہاں رہیں گے نہیں اور کرنل نے آپ کی جس زمین پر قبضہ کیا تھا' اس پر باغ ہے۔ میں اس باغ میں انٹرسٹڈ ہوں۔"

"خریدنا چاہتے ہیں آپ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں بھائی۔ اول تو میری اتنی استطاعت نہیں اور اگر ہو بھی تو میں وہ زمین کیا کوئی بھی زمین اپنے نام نہیں کرا سکتا۔"

میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ "آپ معراج میر تو نہیں؟"

"جی ہاں۔ میں وہی ہوں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔ "آپ لاجونتی کی وجہ سے اس باغ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ زمین میری رہے لیکن آپ کے اختیار میں ہو' آپ آزادی سے وہاں آ جا سکیں۔"

"اختیار کی تو مجھے آرزو نہیں۔ ہاں آپ کی دوسری بات درست ہے۔ میرے پاس اپنے لئے بہت تھوڑی فرصت ہوتی ہے۔ جو بھی تھوڑا بہت وقت ملے' وہ میں وہاں گزارنا چاہتا ہوں۔"

"میرا بس چلے تو میں وہ زمین آپ کے نام کر دوں۔ بہرحال میں آپ کو اس کا مکمل اختیار تحریری طور پر بھی دے سکتا ہوں۔ جس نام سے آپ پسند فرمائیں۔"

"بے حد شکریہ' میں یہی چاہتا ہوں۔"

"ایک ذاتی سوال کر سکتا ہوں آپ سے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ضرور کیجئے۔"

"آپ نے شادی کی؟"

"نہیں۔ کشمیر آزاد ہو گیا اور مجھ بدنصیب کو شہادت نصیب نہ ہوئی تو شاید کر لوں۔"

"ایک بات اور پوچھوں؟"

"میں جانتا ہوں آپ کیا پوچھیں گے۔ بہرحال پوچھئے۔"

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اُس رات آپ لاجونتی کو لینے کیوں نہیں آئے تھے؟"

"زندگی اور موت اللہ کا راز ہے۔ اس رات میں خود آ جاتا تو شاید لاجونتی زندہ ہوتی اور میری بیوی ہوتی۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ہوا یہ کہ ہم نے کیمپ پر حملہ کیا اور یہودیوں کا صفایا کر دیا۔ خوش قسمتی سے اس کا سرغنہ ڈیوڈ زندہ تھا۔ اگرچہ شدید زخمی تھا۔ مجھے اچانک ہی خیال آیا کہ اس کو بچانے کی کوشش کی جائے کیونکہ اس سے بہت کارآمد معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ میں وہ ذمے داری کسی اور کو نہیں سونپ سکتا تھا اور ڈیوڈ کی حالت ایسی تھی کہ اس کے لئے فوری طبی امداد کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک ساتھی کو نشانی کے طور پر کرنل کے جوتے پہنائے کہ انہیں دیکھ کر لاجونتی کو یقین آ جائے گا کہ اس میں نے بھیجا ہے پھر بھی احتیاطاً میں نے اس کے نام ایک رقعہ بھی لکھ دیا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ باڑھ کہاں سے پار کرنی ہے۔ میرا خیال ہے' اندھیرے میں اس سے اندازے کی غلطی ہو گئی اور باڑھ سے منسلک گھنٹی بج گئی' اس کے بعد جو ہوا آپ کو معلوم ہی ہو گا۔"

"اگر لاجونتی اس کا چہرہ دیکھ لیتی تو.........."

"اللہ کو یہی منظور تھا جی۔ ایک تو اندھیرا بہت تھا' ٹارچ کی محدود روشنی میں اپنے پتی کے جوتے دیکھنے کے بعد اس نے کچھ اور دیکھنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔"

"آپ اسے اب بھی یاد کرتے ہیں؟"

"یاد تو آتی ہے پرتاپ صاحب' محبت کی طرح یاد پر بھی آدمی کا اختیار کب ہوتا

ہے۔ میں اس سے محبت بھی نہیں کرنا چاہتا تھا.......... پر ہو گئی۔ بندہ کیا کر سکتا ہے جی۔ اب میں اسے یاد نہیں کرنا چاہتا پر وہ یاد آتی ہے' میں کیا کر سکتا ہو۔ مگر جی پہلے میں مجاہد ہوں اور بعد میں کچھ اور.......... بس وہ دل سے نہیں نکلتی۔ اب تو بس ایک ہی آرزو رہ گئی ہے' شہادت کی۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا پرتاپ صاحب' اب میں چلتا ہوں۔"

میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اگلے روز میں نے اپنی اس زمین کا مختارِ کار سجاد حسین یعنی معراج میر کو مقرر کر دیا۔ واپس آتے وقت میں نے خاصا وقت لیموں کے اس درخت کی چھاؤں میں گزارا۔ وہاں بہت سکون تھا۔ محبت کا سکون۔ لیکن شفتالو کے اس بڑے درخت کو میں نے صرف دور سے دیکھا تھا اور میرے بدن میں کپکپاہٹ دوڑ گئی تھی۔ معراج میر اور لاجونتی کی محبت لیموں کے درخت کے نیچے پروان چڑھی تھی لیکن اس کا آغاز بھی شفتالو کا وہ بڑا پیڑ تھا اور انجام بھی وہی شفتالو کا پیڑ۔

====================

زمین کا گھاؤ

تقریب کی رونقیں اپنے شباب پر تھیں کاروباری لوگوں کی نجی تقریب کی طرح اس تقریب میں بھی لوگ اپنی اپنی طلب کے لحاظ سے دوسروں میں دلچسپی لے رہے تھے۔ کہیں کوئی مِل لگانے کی بات ہو رہی تھی تو کہیں سرمایہ کاری پر کسی نئے زاویے سے غور ہو رہا تھا۔ ایسی ہر تقریب کے بعد دو ایک نئے کاروباری اشتراک ضرور سامنے آتے تھے۔ تقریب برپا کرنے والوں کا بھی یہی منشا ہوتا تھا اور تقریب کے شرکاء کے نزدیک شرکت کی اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہوتا تھا۔

امکان صدیقی صرف خود پر انحصار کرنے کا قائل تھا۔ اس نے زندگی سے یہی ایک سبق سیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آسانی سے لوگوں میں گھلتا ملتا نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ ہال میں چکراتا پھر رہا تھا۔ مگر اس کی نظر بار بار زرد ساڑھی میں ملبوس اس لڑکی کی طرف اٹھ جاتی جو تقریب میں شامل ہونے کے باوجود الگ تھلگ دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کے انداز میں بے حد وقار اور رکھ رکھاؤ تھا۔ کوئی مرد اس سے ہم کلام ہوتا تو نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں شک کے سائے لہرانے لگتے۔

وہ اسے دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ اسے اپنے قریب میزبان خاتون بیگم سہراب کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو اتنے غور سے؟“ بیگم سہراب نے اُسے چونکا دیا۔

”میں اس زرد ساڑھی والی لڑکی کو دیکھ رہا ہوں۔“ امکان نے بے حد سادگی اور سچائی سے کہا۔ ”یہ کون ہے.......... اور کیا کرتی ہے؟“

بیگم سہراب نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ ”دوسرے سوال کا کیا مطلب ہوا؟ یہاں بڑے بڑے کاروباری لوگوں کی بیٹیاں بھی موجود ہیں جنھیں کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ صرف باتیں کرتی ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن یہ لڑکی ان میں سے نہیں۔ یہ تو اپنی دنیا آپ بنانے والی

معلوم ہوتی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں بتائیے۔“

”مان گئے بھئی۔ صاحبِ نظر آدمی ہو تم۔“ بیگم سہراب نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام اُمید ظفر ہے۔ میٹرو ایڈورٹائزنگ میں کسی ایگزیکٹو پوسٹ پر ہے۔ اس کے باپ کی بہت بڑی جائیداد تھی لیکن اس تک کچھ نہیں پہنچا۔ سب کچھ پہلے ہی لٹ گیا۔ بہرحال، اس نے واقعی اپنی دُنیا آپ بنائی ہے۔ کام کے لوگوں کو پہچاننے اور ان سے شناسائی رکھنے والوں کو کبھی کوئی دشواری نہیں ہوتی۔“

میٹرو ایڈورٹائزنگ کے حوالے سے امکان کے ذہن میں ایک نام چبھنے لگا۔ ”مثلاً ضمیر ہاشمی؟“ وہ بولا۔

”ہاں، ضمیر ہاشمی کا اکاؤنٹ اُمید خود ڈیل کرتی ہے۔ اس تعلق کے حوالے سے وہ افواہوں کی زد میں بھی آئی ہے۔“ بیگم سہراب نے کہا۔

امکان کو بیگم سہراب کے لہجے میں کوئی عجیب بات محسوس ہوئی۔ ”لیکن آپ ان افواہوں پر یقین نہیں رکھتیں؟“ اس نے تصدیق چاہی۔

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مگر میں ضمیر ہاشمی کی بیوی نگینہ کے اس بیان پر بھی یقین نہیں رکھتی کہ ضمیر، اُمید سے پدرانہ قسم کی محبت کرتا ہے لیکن بے چاری چالیس سالہ عورت کہہ بھی کیا سکتی ہے۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ جن نظروں سے ضمیر اُمید کو دیکھتا ہے، اگر کوئی باپ ایسی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھے تو یقینی طور پر گرفتار کرلیا جائے۔ وہ اسے حاصل کرنا چاہتا ہے مگر حاصل نہیں کرسکا ہے۔“

”آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں؟“ امکان نے اعتراض کیا۔

”اُمید چھپ کر کبھی کوئی کام نہیں کرتی۔ اگر اسے کسی شادی شدہ مرد سے محبت ہوئی تو بھی وہ بہ بانگِ دہل اس کا اعلان کرے گی۔ اس کی فطرت ہی ایسی ہے۔ یقین کرو، وہ بے حد کھری لڑکی ہے اور مستقل مزاج اتنی ہے کہ جو جی میں ٹھان لے، کر کے رہتی ہے۔“

”لگتی بھی ایسی ہی ہے۔“ امکان نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھرک رہی تھی۔

☆========☆========☆

اُمید ظفر چُپکے چُپکے ہال میں چکراتے امکان صدیقی کو دیکھتی رہی۔ وہ ملک گیر اہمیت کی حامل فرم صدیقی ایسوسی ایٹس کا مالک تھا۔ فرم ہر طرح کی اراضی کی خرید و فروخت کا کام کرتی تھی۔ اس کے علاوہ تعمیراتی کاموں کے ٹھیکے بھی لیے جاتے تھے۔ ان کے بعض اپنے پروجیکٹ بھی تکمیل کے مراحل سے گزر رہے تھے۔

امکان صدیقی طویل القامت اور وجیہہ تھا۔ چال میں کسی ایتھلیٹ کی سی ہمواری اور پھُرتی تھی۔ اُمید نہ جانے کیوں پہلی نظر میں اُسے پسند کیے بغیر نہ رہ سکی۔ حالانکہ مدتوں پہلے اُس نے مردوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیا تھا۔

پھر وہ ٹہلتا ہوا اس کی طرف چلا آیا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس سے نظریں ملیں تو اُمید کو اپنی سانسیں اُتھل پتھل ہوتی محسوس ہوئیں۔

"کمال ہے' آپ سے تعارف ہی نہیں کرایا کسی نے! میرا نام امکان صدیقی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اُمید ظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہ امکان صدیقی کی نگاہوں کی تپش سے خود کو پگھلتا محسوس کر رہی تھی۔ کم از کم نازک جذبوں کو محسوس کرنے والے دل پر جمی ہوئی بے حسی کی برف تو یقیناً پگھل رہی تھی۔

امکان نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ "تو آپ کو مجھ پر فوقیت حاصل ہوگئی۔"

"اور یہ بہت بڑا اعزاز ہے میرے لیے۔ سنا ہے' کوئی آپ پر فوقیت نہیں حاصل کر پاتا۔" اُمید پھر مسکرادی۔

"میں اُمید ہوں......... اُمید ظفر۔"

"کم از کم میرے لیے تو آپ اُمید ہی ہیں۔" امکان نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ پھر شاید اپنے جملے کی معنویت چھپانے کے لیے بولا۔ "عجیب انفرادیت ہے آپ کے نام میں۔"

"آپ کی طرح میں بھی منفرد ہوں۔"

"آپ کی اسی خوبی نے مجھے کھینچا ہے۔"

"واقعی.........؟"

اسی وقت ایک ویٹر نے مداخلت کی۔ "میں معافی چاہتا ہوں جناب! آپ امکان صدیقی صاحب ہیں نا؟" اس نے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں......... کیا بات ہے؟"

"آپ کی کال ہے جناب! انسٹرومنٹ ڈرائنگ روم میں ہے۔ آپ میرے ساتھ چلے چلیے۔"

امکان نے معذرت طلب نظروں سے اُمید کو دیکھا۔ "میں معذرت چاہتا ہوں لیکن آپ سے پھر ملاقات ہوگی' یقیناً۔"

"جی ہاں' کیوں نہیں۔ مجھے مسرت ہوگی۔" اُمید کا لہجہ بُجھا بُجھا سا تھا۔ نہ جانے کیوں' اُسے احساسِ زیاں ہونے لگا۔

ویٹر کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے امکان اپنے ذہن پر زور دیتا رہا کہ کون اسے فون کر سکتا ہے......... کم از کم یہاں؟ کسی کو معلوم نہیں کہ میں سہراب وِلا میں ہونے والی دعوت میں شریک ہوں۔ پھر اُس نے سوچا......... بے شک کسی کو معلوم نہیں مگر معلوم کرنا کچھ اتنا دشوار بھی نہیں۔ خرم نے یقیناً پتا چلا لیا ہوگا۔

خرم' صدیقی ایسوسی ایٹس میں سینئر نائب صدر تھا۔ مگر اس کی اہمیت اور افادیت اس عہدے سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ امکان کے لیے ایک مضبوط بازو کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ جزئیات کا آدمی تھا۔ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھے تھے۔ دونوں کے درمیان گاڑھی چھنتی تھی۔ خرم اس وقت سے امکان کے ساتھ تھا جب امکان نے کاروبار کا آغاز کیا تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ سودے امکان پکڑتا تھا' کانٹریکٹ حاصل کرتا تھا......... اور انھیں پایۂ تکمیل تک خرم پہنچاتا تھا۔

یہ یقیناً خرم ہوگا' امکان نے ریسیور اٹھاتے ہوئے سوچا۔ "ہیلو........." اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

دوسری طرف سے اُسے اپنا نام بتانے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ سخت لہجے میں کہا گیا۔

"تم نے فون تک پہنچنے میں بہت دیر لگائی امکان۔"

وہ آواز سُن کر امکان کا جسم تن سا گیا۔ "خاتون الماس......... کیسی ہیں آپ؟" اُس نے خشک لہجے میں کہا۔ اُس کے وجود میں جانی پہچانی آگ بھڑک اٹھی۔ اُس نے الماس ابدالی کو پچیّس سال پہلے خالہ کہنا چھوڑ دیا تھا۔

"میں اب بھی زندہ ہوں۔" دوسری طرف سے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا گیا۔

"میں تمہارے ہوٹل میں موجود ہوں۔ تیس منٹ کے اندر پہنچ جاؤ۔" اس نادر شاہی حکم کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہونے کی آواز سنائی دی۔

امکان چند لمحے پتھر کے بت کی طرح ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا۔ اس کے وجود میں برہمی لاوے کی طرح کھول رہی تھی۔ پھر اُس نے ریسیور پٹخا مگر فوراً ہی اُسے اُٹھا کر ڈائل ٹون سنی اور خرم کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے پہلی ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔

"خرم اسپیکنگ کہو.......... کچھ بات بنی؟" دوسری طرف سے خرم نے کہا۔

"خرم.......... میں امکان بول رہا ہوں۔"

"امکان.......... تم؟" خرم کے لہجے میں حیرت تھی۔ "اگر یہ فون میری توقع کے مطابق ہوتا تو میں اس کے بعد یقیناً تمہیں فون کرتا۔"

"ابھی الماس ابدالی نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ یہاں آئی ہوئی ہے۔"

"اوہ.......... تو وہ یہاں ہے۔" خرم بڑبڑایا۔

"کیا چکر چل رہا ہے؟" امکان نے پوچھا۔

"یہی تو میں بھی سمجھنا چاہتا ہوں۔" خرم نے آہ بھر کے کہا۔

"آج بڑی بی نے وکیل شمشاد سے اس کے دفتر میں ملاقات کی تھی۔ ملاقات دو گھنٹے جاری رہی۔ اس کا ڈرائیور اسے واپس لے جانے کے لیے پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر ایئرپورٹ جا چکی ہے۔ میں نے باہر جانے والی ہر فلائٹ کی پسنجر لسٹ چیک کرائی ہے۔ اس وقت میں اسی سلسلے میں فون کی توقع کر رہا تھا۔" کچھ توقف کے بعد خرم نے مزید کہا۔ "میرا خیال ہے' اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

"اسے کیسے پتہ چلا کہ میں خیبر ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔" امکان کے لہجے میں اُلجھن تھی۔ "اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے۔"

"اور شمشاد بیگ سے ملاقات اور اس سفر کے درمیان کیا تعلق ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ وہ سمجھوتے کے موڈ میں ہو۔ حالانکہ ایسی کوئی صورت نکل آئے تو مجھے خوشی ہو گی لیکن ایسے ہمارے نصیب کہاں' بہرکیف.......... یہ جو کچھ ہو رہا ہے' مجھے اُس سے بدبو آتی محسوس ہو رہی ہے۔"

"وہ سمجھوتے کی قائل ہی نہیں ہے۔ ممکن ہے' اسے اس بات کی بھنک مل گئی ہو کہ خواب نگر کی جاگیر کے اردگرد کی زمینیں میں نے ہی خریدی ہیں۔ وہ زمینیں جس کمپنی نے خریدی ہیں وہ میری ہی ہے۔"

"یہ بات تو کوئی کاروباری جینئس بھی مشکل ہی سے سمجھ سکے گا۔ شمشاد بیگ ذہین ہے لیکن ایسے پیچیدہ کاروباری معاملات اس کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔"

"بہرحال' فی الوقت اس مسئلے میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔" امکان نے کہا۔ "جو بات بھی ہے' آئندہ پچیس منٹ میں سامنے آجائے گی۔"

"واپس آتے ہی مجھے فون کرنا۔" خرم نے فرمائش کی۔

"ضرور کروں گا۔" امکان نے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

☆=========☆=========☆

"تم دیر سے آئے ہو۔" لہجہ الزام دینے والا تھا۔

"تو کیا ہوا؟" امکان نے بے پروائی سے کہا۔ پھر اس نے اتنی شدت سے دانتوں پر دانت جمائے کہ جبڑے کی نسیں اُبھر آئیں۔ اُسے وہ آٹھ سالہ بچہ یاد آگیا جو زہر اگلنے والی اس زبان کے سامنے سہم کر رہ جاتا تھا۔ ایسے میں الماس ابدالی کی آنکھوں میں بے پناہ نفرت ہوتی تھی۔ آٹھ سالہ بچہ ہمیشہ سوچتا تھا کہ آخر اس نے ایسی کون سی خطا کی ہے جو وہ اس نفرت اور زہر کا سزاوار ٹھہرا ہے۔ اب وہ آٹھ سالہ بچہ بڑا ہو چکا تھا۔ مگر نہیں' ۳۳ سالہ امکان صدیقی کے اندر وہ سہما ہوا بچہ اب بھی موجود تھا۔

امکان نے الماس ابدالی کو بے حد بدمزگی سے دیکھا۔ وہ اس کے کمرے میں یوں بیٹھی تھی جیسے وہ اس کی جاگیر ہو۔ "میں ہوٹل کے منیجر سے بات کروں گا کہ کسی اجنبی عورت کو میرے کمرے میں کیوں آنے دیا گیا۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "ویسے خاتون' میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم نے انھیں قائل کیسے کیا۔ میرا خیال ہے' تم نے انھیں بتایا ہو گا کہ تم میری بے حد محبت کرنے والی پیاری سی خالہ ہو۔" اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"ہرگز نہیں۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے لیے مجھے صفائی کرنے والی ملازمہ کی مٹھی گرم کرنا پڑی۔" بڑی بی نے جوابی وار کیا۔ "میں اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی۔ میرا تعلق صدیقی خاندان سے نہیں ہے۔ میں ابدالی ہوں۔"

وہ مسکرا دیا۔ حالانکہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ "یہ بتاؤ خاتون الماس کہ مجھے اس ناخوشگوار اور زبردستی کی ملاقات کا اعزاز کیوں حاصل ہوا ہے؟" اس نے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

الماس کے ہونٹ بھنچ گئے۔ امکان کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ ابھر آئی۔

"بہت پُراعتماد نظر آرہے ہو۔" الماس نے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں یقین ہے کہ میں اپنی وصیت میں خواب نگر کی جاگیر تمہارے لیے چھوڑنے پر مجبور ہوں؟"

"جبکہ تمہارے لیے یہ تصور ہی اذیت ناک ہے کہ خواب نگر میرے قبضے میں آئے لیکن تم اپنی وراثت کی شرائط کی وجہ سے مجبور ہو۔ تمہاری موت کے بعد یہ جاگیر خود بہ خود میرے حصے میں آئے گی۔ کیونکہ رُوئے زمین پر میرے علاوہ تمہارا کوئی رشتے دار موجود نہیں۔ اگر میں بھی نہ ہوتا تو یہ سب کچھ خود بہ خود بحق سرکار چلا جاتا۔ اب تم پچھتاتی ہو گی کہ اولاد سے کیوں محروم ہو۔ اگر تمہاری اولاد ہوتی، خاتون الماس تو تمہیں اپنے ناپسندیدہ اور قابلِ نفرت بھانجے کے وجود کا زہر تو نہ پینا پڑتا۔"

"میرے نزدیک افسوس ناک بات ہے یہ کہ تمہیں خواب نگر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" الماس ابدالی نے حقیقت پسندانہ لہجے میں کہا۔

"تمہارا خیال غلط ہے خاتون۔" امکان کا لہجہ نرم تھا۔ "میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی گیارہ سال وہاں گزارے ہیں۔ میری ماں وہیں موت سے ہمکنار ہوئی تھی اور اس کا جسم بھی سرد بھی نہیں پڑا تھا کہ تم نے ہمیں گھر سے بے گھر کردیا۔"

"میں نے ایک بھیڑیے اور اس کے پلّے سے نجات حاصل کی تھی۔ اگر مجھے اپنی بہن کا خیال نہ ہوتا تو یہ نیک کام میں بہت پہلے کر چکی ہوتی۔" الماس کے لہجے میں پچھتاوے کی رمق بھی نہیں تھی۔

"یہ بات تم ہمیں نکالنے سے پہلے، برسوں کہتی رہیں۔ تمہیں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ سُن کر میری ماں پر کیا گزرتی ہوگی۔" پچھلی باتیں یاد کر کے امکان کا وجود تلخی سے بھر گیا۔

"تمہارا یہ اچھا لباس، خوش اطواری، یہ دل موہ لینے والی مسکراہٹ ساری دنیا کو بے وقوف بنا سکتی ہے، مجھے نہیں۔ لوگ تمہاری اس صلاحیت کو سراہتے ہوں گے کہ تم

مدِمقابل کی کمزوری بھانپ کر اس کے ذریعے اپنے لیے راستہ بنا سکتے ہو مگر میں جانتی ہوں کہ تم بھیڑیے کی خُو لے کر پیدا ہوئے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں موقع مل جائے تو تم خواب نگر کا کیا حشر کرو گے۔ میں جانتی ہوں، تمہارے خاندان کا کوئی بھی فرد کسی چیز کو چُھولے تو وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔"

امکان چند لمحے کسی سوچ میں گم رہا پھر پُرخیال لہجے میں بولا۔ "کچھ چیزیں اسی قابل ہوتی ہیں کہ تباہ و برباد ہو جائیں۔ وہ مقام جہاں صرف نفرتیں پروان چڑھی ہوں، وہ گھر جس کی فضا میں محبت کی خوشبو ایک لمحے کے لئے بھی نہ رچی ہو اسی قابل ہے۔"

بڑی بی نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی کو دو تین بار فرش پر پٹخا اور نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ "خواب نگر کبھی تمہیں نہیں مل سکے گا۔ مر کر بھی نہیں۔"

امکان کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری۔ اُس نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں اپنی خالہ کو دیکھا۔ "خاتون.......... مجھے خواب نگر سے محروم رکھنے کی صرف ایک صورت ہے۔ مجھے قتل کر دو، اور کسی طرح تم مجھے اس سے محروم نہیں کر سکتیں۔ میں تمہارا واحد رشتے دار اور وارث ہوں۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔"

"واقعی؟" اس بار الماس ابدالی کے لہجے میں طنز تھا۔ "تمہیں یہ بات اتنے وثوق سے نہیں کہنا چاہیے۔"

امکان فکر مند ہو گیا مگر اس نے اپنی فکر مندی کو مسکراہٹ میں چھپا لیا۔ "تمہاری یہ بات بے بنیاد تو نہیں ہو سکتی، کچھ سوچ سمجھ کر ہی کہا ہو گا تم نے۔"

"ظاہر ہے، میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم رُوئے زمین پر میرے واحد رشتے دار نہیں ہو۔"

"کیا میں یقین کر لوں اس بات پر؟" امکان نے مضحکہ اُڑایا۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے، سچ ہے۔"

امکان چند لمحے اُسے بغور دیکھتا رہا۔ "اچھی کوشش کی ہے تم نے خاتون الماس۔" بالآخر اُس نے کہا۔ "لیکن تمہارا ایسا کوئی رشتے دار ہوتا تو تم اب سے بہت پہلے یہ بات بتا چکی ہوتیں۔"

"حقیقت یہ ہے کہ میں نے بڑی کوشش کے بعد اسے تلاش کیا ہے۔" الماس کے

لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔

امکان کو یقین تو نہیں آیا لیکن الماس کی آنکھوں کی چمک اسے خوف میں مبتلا کر رہی تھی۔

"میں نے سوچا' یہ اطلاع سب سے پہلے تمہیں ملنی چاہیے۔ میں اس خبر پر تمھارا ردِعمل' تمھارے چہرے کا تاثر دیکھنا چاہتی تھی۔ سمجھ رہے ہو نا؟" الماس نے توقف کیا اور چھیڑنے والی نظروں سے امکان کو دیکھتی رہی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم خواب نگر حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ تمہیں یقین تھا کہ بالآخر خواب نگر تمہیں ملے گا۔ لالچ تمھارا خاندانی وصف ہے لیکن تمہیں یہ اندازہ بھی ہونا چاہیے کہ ہم ابدالی لوگ کسی کو ناکام بنانے پر تُل جائیں تو ہمیں دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"

"مجھے یہ اندازہ ہے۔"

الماس دروازے کی طرف بڑھی۔ امکان نے آگے بڑھ کر اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ الماس ابدالی چوکھٹ پر رُک گئی۔ اس کی آنکھوں میں طمانیت کی چمک ہلکورے لے رہی تھی۔ "یہ ایسا نادر موقع ہے کہ میں تم سے ملاقات کرکے محظوظ ہوئی ہوں۔"

"تب تو بہتر ہے کہ تم اس سے تا دیر حظ اٹھاتی رہو۔ کیونکہ یہ احساس عارضی ہے۔" امکان کے ہونٹوں پر سرد مسکراہٹ تھی۔

"میرا ارادہ بھی یہی ہے مگر تم زیادہ دیر خوش فہمی میں نہیں رہو گے۔" الماس نے کہا اور دروازے سے گزر گئی۔ امکان اس کی تنی ہوئی گردن کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے دروازہ بند کیا اور کمرے میں چلا آیا۔ ذرا دیر کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے خرم کو اس کی ایک پرائیوٹ لائن پر رِنگ کیا۔

پہلے کی طرح اس بار بھی پہلی ہی گھنٹی کے بعد ریسیور اٹھالیا گیا۔ "ہیلو۔" خرم کی آواز سنائی دی۔

"امکان بول رہا ہوں۔" اُس نے دروازے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ "خرم' ایسا لگتا ہے کہ ہمارے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے۔ الماس کا دعویٰ ہے کہ اُس نے اپنا ایک اور رشتے دار ڈھونڈ نکالا ہے۔ وہ اسے اپنا وارث مقرر کرے گی۔"

"کیا کہہ رہے ہو امکان؟ خدا کی پناہ! یہ تو سچ نہیں ہو سکتا' یا تمہیں یقین ہے اس بات پر؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اس سلسلے میں تو معلومات حاصل کرنا پڑیں گی۔"

☆=========☆=========☆

اُمید نے اُطلاعی گھنٹی کی آواز سُنی اور بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر ایک معمر خاتون کھڑی تھی۔ وہ چند لمحے اُمید کو غائرانہ نظروں سے تکتی رہی۔ بالآخر اس نے لب کشائی کی۔ "میں اس طرح تمہیں گھورنے پر معافی چاہتی ہوں۔" اس کی آواز میں خوش گوارسی گمبھیرتا تھی۔ "تمھارے بال بالکل نیلم ابدالی جیسے ہیں۔ ان کا پورٹریٹ ہماری لائبریری میں آویزاں ہے۔"

"آپ کون ہیں؟" اُمید کے لہجے میں چیلنج تھا۔

"میں الماس ابدالی ہوں۔" معمر خاتون نے ایسے بتایا جیسے کوئی اہم اعلان کر رہی ہو۔ اس کے لبوں پر ایک مسرت بھری مسکراہٹ تھرکی اور اس کا جھریوں بھرا چہرہ اس مسکراہٹ سے جگمگا اٹھا۔ "اور تم یقیناً کرن ناصر ابدالی ہو۔" اُس نے مزید کہا۔

"اُمید ظفر۔" اُمید نے خود کار انداز میں تردید کرڈالی۔ "میں اُمید ظفر ہوں۔"

"اوہ.......... تو تم شادی شدہ ہو؟"

"نہیں بیوہ ہوں میں۔" اُمید کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"ہاں.......... ہاں' یاد آیا۔ شمشاد نے مجھے بتایا تو تھا۔"

"آیئے.......... اندر آجایئے نا۔" اُمید نے ایک طرف ہٹ کر اُسے راستہ دیا۔

"شکریہ۔"

اُمید اُسے ڈرائنگ رُوم میں لے آئی۔ اُس کے صوفے پر بیٹھنے کے بعد اُس نے پوچھا۔ "کافی پئیں گی یا چائے؟"

"زحمت نہ ہو تو چائے پلا دو۔"

"زحمت کی کیا بات ہے۔ آپ اتنی دیر کوئی میگزین دیکھیں' میں ابھی آئی۔" اُمید نے میز پر رکھے ہوئے رسالوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور کچن کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے پر چائے کی دو پیالیاں رکھے واپس آئی۔

الماس ابدالی چند لمحے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتی رہی۔ پھر بولی۔ ”فلیٹ تو اچھا ہے تمہارا لیکن خواب نگر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔“

”خواب نگر کسی کا بھی ہو‘ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اُس جیسی کوئی دوسری جگہ دنیا میں نہیں ہوتی۔“ اُمید نے کہا۔

”جس خواب نگر کی میں بات کر رہی ہوں‘ وہ سچ مچ کا ہے۔“

”آپ خواب نگر ہی میں رہتی ہیں؟“

”ہاں‘ وہ ہماری آبائی جاگیر ہے۔ وہاں ہمارا آبائی مکان ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے ہمارا خاندان وہاں آباد ہے اور انشاء اللہ صدیوں تک آباد رہے گا۔“

”یہ ہے کہاں؟“

”کشمیر میں۔ مظفر آباد سے ایک گھنٹے کی مسافت پر۔“ الماس نے بتایا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ اُمید اس خاموشی کا مفہوم سمجھ گئی۔ معمر خاتون الماس ابدالی کی خواہش تھی کہ اب وہ سوال کرے اور خاموشی سے بہرحال یہی بہتر تھا۔ چنانچہ اس نے پوچھا۔

”آپ نے ابھی شمشاد کا تذکرہ کیا تھا۔ یہ شمشاد کون ہے؟ اور نیلم ابدالی.........؟“

”شمشاد بیگ ہمارا خاندانی وکیل ہے۔ برسوں سے وہ ہمارے لیے کام کر رہا ہے۔ اُسی کی کوششوں کے نتیجے میں مَیں تم تک پہنچ سکی ہوں۔ نیلم ابدالی میری دادی تھیں۔ حشمت ابدالی ان کے بھائی تھے۔“

حشمت بدالی کا نام لیتے ہوئے الماس کے لہجے میں کوئی چیز تھی جو اس نام کی اہمیت جتاتی محسوس ہوئی۔ ”آپ کے خیال میں مجھے اس نام سے آشنا ہونا چاہیے؟“ اُس نے پوچھا۔

”ہاں‘ حشمت ابدالی تمہارے پَردادا تھے۔“ الماس نے آخری گھونٹ لے کر پیالی میز پر رکھ دی۔ ”لگتا ہے تم اپنی ددھیال سے پوری طرح واقف نہیں ہو؟“

”جی ہاں‘ یہی بات ہے۔“ اُمید کو اعتراف کرنا پڑا۔ وہ متفکر نظر آنے لگی۔ ”مجھے پپّا نے بس اتنا بتایا تھا کہ ان کے آباؤ اجداد اٹھارھویں صدی میں افغانستان سے ہجرت کرکے یہاں آئے تھے۔ ان کی عسکری خدمات کا اعتراف تاریخ بھی کرتی ہے۔ اس کے صلے میں

انہیں جاگیریں ملیں۔ اس کے سوا مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

”یہ ہوئی نا بات۔“ الماس نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ ”مجھے حشمت ابدالی کی اولاد ہی کی تلاش تھی۔ یقین کرو‘ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ حشمت ابدالی نے خواب نگر چھوڑا تو پھر کبھی پلٹ کر خبر لی نہ کوئی خط لکھا۔ ہمیں تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ ان کی اولاد بھی اپنے نام کے ساتھ ابدالی لگاتی ہے یا نہیں۔“

”لیجیے.......... یہ کیا بات ہوئی۔ اپنا خاندانی نام کون ترک کرتا ہے۔“ اُمید نے بدمزگی سے کہا۔

”کون جانے۔ جو لوگ اپنی دنیا آپ بناتے ہیں‘ انہیں آبائی نام کی اتنی پروا نہیں رہتی۔ نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرنے والے ماضی سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔“

بات معقول تھی مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ تاہم ایسا ہونا بعید از قیاس بھی نہیں تھا۔ خود اُمید نے بھی یہی کیا تھا۔ بیوگی کے باوجود اس نے اپنے نام کے ساتھ مرحوم شوہر کا نام لگانا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے باوجود لوگ جانتے تھے کہ وہ ابدالی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

”اب مجھے اپنے بارے میں بتاؤ تم کرتی کیا ہو؟“ الماس نے پوچھا۔

”ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں اکاؤنٹ ایگزیکٹو ہوں۔“

”تم اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہو؟“

”جی ہاں۔“

”اور تمہارے والد اور والدہ‘ دونوں..........؟“

”جی ہاں۔ مما کا انتقال جب ہوا تو میں بہت چھوٹی تھی اور اب تو پپّا کو گئے ہوئے گیارہ سال ہوگئے ہیں۔“ اُمید افسردہ ہوگئی۔

”ہم دونوں کے درمیان بہت کچھ مشترک ہے۔“ الماس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ”ہمیں لڑکپن ہی میں ذمے داریاں اُٹھانا پڑگئیں۔ میری امی میری چھوٹی بہن کو جنم دینے کے چند گھنٹے بعد انتقال کرگئی تھیں۔ میری عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ مجھے گھر سنبھالنے کے علاوہ چھوٹی بہن کی پرورش بھی کرنا تھی۔ پھر میں اُنیس سال کی تھی کہ ابا جان بھی چل بسے۔ اچانک مجھے پتا چلا کہ اب خواب نگر بھی میرا ہے.......... میری ذمے داری

ہے۔ جاگیر سنبھالنا بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔ ہمارا بہت بڑا فارم ہے' زمینیں ہیں۔"

"اچھا! میں تو سمجھتی تھی' خواب نگر کوئی چھوٹا سا گاؤں ہوگا۔"

"گاؤں ہی سمجھ لو۔ ہمارے پاس بارہ سو ایکڑ زمین ہے۔ بہت خوب صورت علاقہ ہے۔ آسمان سے سرگوشیاں کرتے پہاڑ' دیودار کے درخت اور پہاڑوں پر بچھے ہوئے سرسبز کھیت۔ ہمارے چاولوں کی مہک دور دور تک مشہور ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں ہمارا مکان ہے جو خواب محل کہلاتا ہے۔ تین منزلہ مکان ہے اور اتنا خوب صورت کہ تم دیکھتی رہ جاؤ۔ دیکھ لینا خواب محل تمہیں بہت زیادہ پسند آئے گا۔"

"جی ہاں......... یقیناً!" اُمید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ معمر عورت کی اپنے گھر سے بے پناہ اور سچی محبت نے اس کے دل کو چھو لیا تھا۔ "حالانکہ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ میں کبھی خواب نگر جاسکوں گی......... خواب محل کو دیکھ سکوں گی۔"

الماس ابدالی بُری طرح چونکی۔ "کیوں......... تم ضرور دیکھو گی۔ نہ صرف دیکھو گی بلکہ وہاں رہو گی۔ یہ تو لازمی ہے کیونکہ میرے مرنے کے بعد یہ سب کچھ تمہارا ہو گا۔"

ایک لمحے کو تو اُمید اسے دیکھتی رہ گئی۔ "کیا......... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" بالآخر اُس نے بے یقینی سے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ فریبِ ساعت میں مبتلا ہوگئی ہے۔

"تم ابدالی ہو۔ یہ بات میں نے پہلی نظر میں ہی جان لی تھی۔ بات صرف نقوش کی مشابہت کی نہیں۔ میں نے تم میں بے پناہ خود داری' وقار اور کامیابی کے لیے طویل جدو جہد کی خصوصیت بھی دیکھی ہے۔"

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔" اُمید نے اُلجھن بھرے لہجے میں کہا۔

"حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ خواب نگر پر کسی ابدالی ہی کا حق ہو سکتا ہے۔ وصیت نامے کی رُو سے اگر کوئی رشتے دار موجود نہیں تو جاگیر خود بہ خود سرکاری ملکیت قرار پائے گی۔ اسی لیے تو یہ بات بہت اہم تھی کہ میں تمہیں کسی نہ کسی طرح تلاش کرلوں۔ ایک وقت تھا' میں سوچتی تھی کہ........." وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ اس کا سر نفی میں ہلنے لگا۔

"بہرحال' اب میں فکر مند نہیں ہوں۔ تم خواب نگر کب چل سکتی ہو؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ یہ بھی نہیں کہ میں وہاں کبھی جا بھی سکوں گی یا نہیں۔ اب دیکھیں نا۔ یہاں میری مصروفیات........."

"ایک نہ ایک دن تمہیں آنا ہوگا۔" الماس کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "تم اعتراف کرو نہ کرو' تم حقیقی ابدالی ہو۔ تمہاری جڑیں درحقیقت خواب نگر ہی میں ہیں۔ جڑیں آدمی کو بالآخر اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔"

"ممکن ہے۔" اُمید نے کہا۔ مگر اسے الماس ابدالی کی کسی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

اپنے مشن کی تکمیل کے بعد الماس ابدالی نے اُمید کو خدا حافظ کہا اور اپنی کار میں بیٹھ کر ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوگئی۔ اُمید اُسے رخصت کرکے ڈرائنگ روم میں پلٹ آئی۔ اب وہ تنہا تھی۔ اُسے ہر چیز بے حد غیر حقیقی لگ رہی تھی۔ اُسے تو الماس ابدالی کی آمد اور اس کے بعد اس سے گفتگو بھی کسی خواب کا حصہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی......... کہیں یہ سب میرے تخیل کا کرشمہ تو نہیں لیکن ٹرے پر رکھی ہوئی چائے کی خالی پیالیاں کچھ اور ہی کہانی سنا رہی تھیں۔ اس کے باوجود بے یقینی اپنی جگہ موجود تھی۔ اگر جو کچھ ہوا' حقیقی تھا تو پھر وہ صرف اتنا کہہ سکتی تھی کہ الماس ابدالی یقیناً کوئی کھسکی ہوئی بوڑھی خاتون ہے' جو ضروری نہیں کہ کسی جاگیر کی مالک ہو۔ خواب نگر بھی ممکن ہے' کوئی خواب ہی ہو۔

اچانک اس کی نگاہوں میں امکان صدیقی کا سراپا اُبھر آیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک' اس کی مسکراہٹ' اس کی کشش اور پُر غرور چال۔ وہ سب کچھ بے حد حقیقی تھا۔ خواب نگر اور الماس ابدالی سے بالکل مختلف۔ وہ آپ ہی آپ مسکرادی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی کوئی مرد اُسے اس طرح متاثر کرسکے گا۔ امکان نے اُس سے پھر ملنے کو کہا تھا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ واقعی اس سے مل سکے گی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ امکان نے یہ بات محض رسماً کہی ہو اور کہنے کے چند منٹ بعد بھول گیا ہو کہ اُس نے ایسی کوئی بات کی تھی۔ کاش......... ایسا نہ ہو!

☆=========☆=========☆

ضمیر ہاشمی کے ساتھ لنچ بے حد ناخوش گوار ثابت ہوا تھا۔ ضمیر ہاشمی اس کی کمپنی کا بے حد اہم کلائنٹ تھا۔ اس کا اکاؤنٹ اُمید خود ہی ڈیل کرتی تھی۔ ان دونوں کا کاروباری تعلق پانچ سال پر محیط تھا۔ افسوس ناک بات یہ تھی کہ ضمیر ہاشمی نے آج پانچ سال بعد اس سے نہایت بے ہودہ گفتگو کی تھی۔ بے حد شرمناک پیش کش کی تھی۔

اُمید اپنے آفس میں داخل ہوئی تو اس کی سیکریٹری نے سر اُٹھا کر اُسے دیکھا اور احتراماً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پر اطمینان جھلک آیا۔ "شکر ہے' آپ آگئیں۔" اس نے کہا۔

اُمید ظفر اُسے نظرانداز کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُسے زبردست جھٹکا لگا۔ وہ گویا اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔

اس کی سیکریٹری سیما اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ "ابھی ایک قاصد یہ پھول دے کر گیا ہے۔" اُس نے وضاحت کی۔

اُمید نے کمرے کا جائزہ لیا۔ پھول! وہ تو پورا گلستاں معلوم ہو رہا تھا۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے.......... سرخ گلاب۔ ہر طرف ان کی مہک بول رہی تھی۔

"آپ کو ناقابلِ یقین لگ رہا ہے یہ سب کچھ؟" سیما نے پوچھا۔

اُمید نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ بڑی کوشش کے بعد اب وہ اپنی حیرت پر قابو پا چکی تھی۔ اُس نے سیما سے پوچھا۔ "کس نے بھیجے ہیں یہ پھول؟"

"آپ کی میز پر کارڈ موجود ہے۔ میں نے فون کے پاس رکھ دیا تھا۔" سیما نے جواب دیا۔

اُمید میز کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی دانست میں صرف ایک شخص تھا جو اتنی پروا کر سکتا تھا۔ اس کے لیے اتنی فضول خرچی کر سکتا تھا۔ اس نے لفافہ اٹھایا اور اسے کھولا۔ اس نے کارڈ نکالا اور بڑبڑائی۔ "ہاشمی صاحب اگر یہ سمجھتے ہیں کہ.........." پھر اس کی نگاہ کارڈ کی تحریر پر پڑی اور اُس کی بڑبڑاہٹ گھُٹ گئی۔ کارڈ پر خوب صورت خط میں تحریر تھا.......... "اگلی ملاقات تک کے لیے.......... امکان صدیقی۔"

"امکان صدیقی!" اُمید کو اپنی بصارت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اسی وقت سیما نے پکارا۔ "آپ کی کال ہے۔ دو نمبر انسٹرومنٹ پر' کوئی امکان صدیقی صاحب ہیں۔"

اُمید نے ریسیور اٹھایا اور لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "ہیلو۔" لیکن اسے احساس تھا کہ اس کی آواز سے ہیجان جھلک رہا ہوگا۔ کسی شخص کا کمرا اس طرح پھولوں سے بھرا ہوا ہو تو کون نارمل رہ سکتا ہے۔

"اُمید.......... میں امکان بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

اُمید کو اس کی آواز میں بھی گلابوں کی مہک رچی محسوس ہوئی۔ اس کی نظروں میں امکان صدیقی کا سراپا بھر گیا۔

"فی الوقت تو میں بُری طرح گلابوں میں گھری ہوئی ہوں۔ ہر طرف پھول ہی پھول ہیں۔ بہت اچھا لگ رہا ہے یہ سب۔"

"مجھے خوشی ہوئی کہ تمہیں اچھا لگا۔"

"بہت زیادہ۔"

"میں نے فون اس لیے کیا ہے کہ جمعرات کی رات نشاط سینما میں فلم لو اسٹوری کا پریمئر ہو رہا ہے۔ میرے پاس ایک اضافی دعوت نامہ بھی ہے۔ تم میرے ساتھ چلو گی؟"

"میرا پروگرام تو کچھ اور تھا مگر اسے تبدیل کرنے میں کچھ دشواری نہیں ہوگی۔"

اُمید کو اپنی سانسوں کی لَے پر قابو نہیں رہا۔ وہ اتنی دور سے بھی جادو جگا رہا تھا۔ دھڑکنیں بے ربط ہوئی جا رہی تھیں۔

"شکریہ' اب اپنا پتا بتا دو' میں تمہیں پک کر لوں گا۔"

اُمید نے اسے اپنے فلیٹ کا پتا سمجھا دیا.......... اور پھر کارڈ کے لفظ دہرا دیئے۔

"اگلی ملاقات تک کے لیے خدا حافظ۔" پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں اب بھی کارڈ موجود تھا۔

☆==========☆==========☆

اُمید امکان کے ساتھ پریمئر میں شرکت کے لیے نشاط سینما پہنچی تو تمام لوگوں کی نگاہیں اُن پر جم گئیں۔ ہر نظر میں ستائش تھی لیکن اُمید سے زیادہ امکان لوگوں کی توجہ کا مرکز تھا۔ پریمئر کے شرکاء میں بڑی تعداد خواتین کی تھی۔ خواتین دلچسپی بھری متجسس نگاہوں سے امکان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی چمکیلی آنکھوں اور شریر مسکراہٹ نے دلوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ اُمید کے حصے میں خواتین کی حاسدانہ نظریں آئی تھیں لیکن اُمید کے لیے وہ نظریں بے حد مسرت خیز تھیں۔

پھر اسے ضمیر ہاشمی نظر آیا۔ وہ نپے تُلے قدموں سے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لنچ والی بدمزگی کے بعد سے اب تک اُمید کی ضمیر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اُمید نے

نظریں اٹھا کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ اسے اپنی قوت کا احساس دلا رہا ہے۔ اپنی برتری جتا رہا ہے۔ یہ بات وہ پہلے ہی جانتی تھی کہ اگر ضمیر کسی چیز کی خواہش کرے اور وہ اسے نہ ملے تو وہ اسے اپنی توہین سمجھتا ہے۔

ضمیر ہاشمی کی نظریں اُمید کے سراپے سے ہٹیں اور امکان پر جم گئیں۔ اس کی آنکھوں میں جو تاثر اُبھرا' وہ طلب اور الزام کے بَین بَین تھا۔

"کیسے ہیں ہاشمی صاحب؟" اُمید نے خوش گوار لہجے میں پوچھا مگر اس کی آواز میں سرد مہری تھی۔

"ٹھیک ہوں اُمید۔ تم سناؤ۔" ضمیر ہاشمی نے سر کو ہلکا سا خم کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے' گزشتہ ہفتے بیگم سہراب کی پارٹی میں آپ امکان صدیقی صاحب سے ملے ہوں گے۔" اُمید نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔" ضمیر ہاشمی نے جواب دیا اور مصافحے کے لیے امکان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "اور صدیقی صاحب' ناز صاحبہ تو ٹھیک ٹھاک ہیں.......... وہی آپ کی دوست۔ ویسے وہ بہت اچھی فنکارہ ہیں۔ میں تو ان کے پرستاروں میں سے ہوں۔"

انھوں نے ہاتھ ملایا۔ اُمید کو فضا کچھ کشیدہ سی محسوس ہونے لگی۔ بظاہر تو وہ بے حد گرم جوشی سے مصافحہ کر رہے تھے مگر درحقیقت وہ قوت آزمائی کا مقابلہ تھا۔ لگتا تھا دو حریف پہلی بار ایک دوسرے کے مقابل آئے ہیں اور ایک دوسرے کی قوّت کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

"ناز کے علاوہ بھی بہت سی خواتین میری دوست ہیں۔ خدا کا شکر ہے' سب بہ خیروعافیت ہیں۔" امکان نے جواب دیا۔

"اوہ۔" ضمیر ہاشمی کے اس ایک لفظ میں بہت بڑے چیلنج کی پکار تھی لیکن اُمید اُسے محسوس نہ کر سکی۔ ویسے بھی ایک عجیب سا احساس اُسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ کسی کی نگاہیں اسے اپنے وجود میں سُوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا' کوئی چُپکے چُپکے اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔

"نگینہ آپا کیسی ہیں؟" اُمید نے بے دھیانی سے پوچھا۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی تاکہ اس شخص کو دیکھ سکے جو اُسے گھور رہا تھا۔

نگاہوں کی چبھن کا احساس بہ دستور تھا۔

"آج کل وہ اپنے بال بڑھانے کے چکر میں ہے۔" ضمیر نے جواب دیا۔ "طرح طرح کے نسخے آزمائے جا رہے ہیں۔"

اُمید' ضمیر ہاشمی کے جواب کا دوسرا حصّہ نہیں سُن سکی۔ اس کی نظر نیوی بلیو کلر کا سوٹ پہنے ہوئے اس شخص پر اٹک گئی جو ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ نہ جانے کیوں جانا پہچانا لگا لیکن وہ یہ یاد نہیں کر پائی کہ اس نے اس شخص کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔

پھر وہ شخص اچانک پلٹا اور ایک طرف چل دیا۔ اس کے انداز میں اس قدر اعتماد تھا کہ اُمید کو سوچنا پڑا' کہیں وہ سنیما کے سیکیورٹی اسٹاف سے تو تعلق نہیں رکھتا۔ پھر اس نے سوچا' اگر کوئی مجھے گھور رہا ہے تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ مرد تو ہمیشہ ہی مجھے گھورتے رہتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔" ضمیر ہاشمی کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ "میں ذرا تہمینہ سے مل لوں۔"

"ضرور۔" اُمید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وقتی طور پر اس کی توجہ گھورنے والے کی طرف سے ہٹ گئی۔ وہ ضمیر ہاشمی کو تہمینہ کی طرف جاتے دیکھتی رہی۔

"تمھاری ایجنسی اس کی مصنوعات کی پبلسٹی کرتی ہے نا؟" امکان نے اُمید سے پوچھا۔

"ہاں۔" اُمید نے جواب دیا اور سوچا' ممکن ہے' اسے بھی ان افواہوں کا علم ہو جو کاروباری حلقوں میں میرے اور ضمیر ہاشمی کے بارے میں مشہور ہیں۔ اُس نے غور سے امکان کے چہرے کو دیکھا۔ مگر وہاں ایسا کوئی تاثر نہیں تھا جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا۔

"آج کل ہم اس کے لیے کچھ نئے کمرشلز کی تیاری میں مصروف ہیں۔"

"سیزن کی وجہ سے؟"

"ہاں' ایک وجہ یہ بھی ہے۔"

"کچھ یوں بھی ہے کہ لوگ ایک ہی کمرشل دیکھ دیکھ کے اُکتا جاتے ہیں۔ ہے نا؟"

اُمید کھل کھلا کر ہنس دی۔ "آپ تو ٹی وی کے ناظرین کے سے انداز میں بات کر

رہے ہیں۔"

"ظاہر ہے۔ میں ہوں بھی۔" امکان بھی ہنس دیا۔ "اب تو عید بھی قریب آ رہی ہے۔ آپ عید کیسے مناتی ہیں؟ بہت خوش ہوتی ہوں گی؟"

اُمید سنجیدہ ہوگئی۔ "نہیں' عید تو ان کی ہوتی ہے جن کے بڑے زندہ ہوں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ عید بہت پہلے معنویت کھو بیٹھی تھی۔"

"تو تم بالکل اکیلی ہو؟"

"ہاں' میں ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں کے سائے سے تو میں بچپن ہی میں محروم ہوگئی تھی۔ اب تو پپا کے انتقال کو بھی گیارہ برس ہوگئے ہیں۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے........" اُمید نے اچانک بڑی نزاکت سے اپنے کندھے جھٹکے اور بولی۔

"خیر........ چھوڑیں ان باتوں کو۔ آپ کا تو ماشاء اللہ بھرا پُرا گھر ہوگا۔ بہت سارے بہن بھائی........" اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"نہیں' میں بھی تم جیسا ہی ہوں۔" امکان نے نرم لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "میرے لیے بھی عید کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے۔ میں بھی والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور دونوں کے سائے سے محروم ہو چکا ہوں۔" وہ مسکرایا مگر اس کی مسکراہٹ میں کرب تھا اور ایک نئی شناسائی کی تفہیم۔ وہ مسکراہٹ اُمید کے دل کو چھو گئی۔

اُمید بھی مسکرادی۔ "مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ پانی پی آؤں۔" اس نے اجازت طلب انداز میں کہا اور کولر کی طرف چل دی۔ گلزار نے اسے کُولر کی طرف جاتے دیکھا تو مہمانوں کے درمیان جگہ بناتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ وہ اُمید سے دو قدم کے فاصلے پر تھا کہ اُمید نے اس کی موجودگی محسوس کرلی۔ وہ چونکی اور اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے گلزار کو دیکھا۔ گلزار رکا' اس نے جیب سے ایک پرچا نکالا اور اُمید کو تھما دیا۔

اُمید کی پیشانی پر لکیریں اُبھر آئیں۔ اس نے ایک نظر گلزار کو اور ایک نظر اپنی انگلیوں میں دبے ہوئے کاغذ کے پُرزے کو دیکھا۔ گلزار پلٹا اور مہمانوں کے درمیان جگہ بناتا بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ اُمید چند لمحے اُسے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کاغذ کے پُرزے پر نظر ڈالی۔ اُس پر لکھا تھا........ "ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ سنبھل جاؤ اور اس سے دور رہو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پچھتاؤ گی۔"

پیغام کے تہدیدی انداز نے اُمید کو دہلا دیا۔ اُس نے نظریں اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اُسے رقعہ دینے والے کی ایک جھلک نظر آئی۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔ "اس سے دور رہو۔" رقعے کے یہ الفاظ اُمید کے ذہن میں کسی بازگشت کی طرح گونج رہے تھے۔ پھر اسے خیال آیا کہ پرچا دینے والا شخص وہی تھا جو کچھ دیر پہلے اسے گھور رہا تھا۔

وہ پیغام بہرحال اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ سوال یہ تھا کہ اسے کس سے دور رہنے کی ہدایت کی گئی تھی؟ ضمیر ہاشمی سے یا امکان صدیقی سے؟ پھر یہ بھی تھا کہ یہ پرچا کس کی طرف سے آیا ہے؟ اگر اس' سے مراد ضمیر ہاشمی تھا' تب تو یہ نگینہ کی حرکت ہو سکتی تھی اور اگر اشارہ امکان کی طرف تھا تو........ ممکن ہے' امکان کی کوئی دوست ہو۔ ممکن ہے' امکان کی کوئی دوست ایسی بھی ہو جو اُسے اپنی ملکیت سمجھتی ہو۔

"چلو' شو شروع ہونے والا ہے۔" امکان نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

اُمید نے چونک کر اسے دیکھا۔ مگر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے سر اٹھا کر امکان کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے تہیہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو جائے' وہ اس کی رفاقت کے ان حسین لمحوں کا زیاں برداشت نہیں کرے گی۔ ایک ایک لمحے سے حظ اٹھائے گی۔ "کیوں نہیں۔ آؤ چلیں۔"

☆=========☆=========☆

فلم اچھی تھی۔ امکان بڑی توجہ سے فلم دیکھتا رہا۔ فلم میں ایک کردار ایسا تھا جو ہو بہو الماس ابدالی جیسا تھا۔ نفرت کی آگ میں پھنکتا ہوا منتقم مزاج۔ فلم دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں' وہ ڈپریس ہو گیا۔ شاید اسے اپنی ایک ہفتے کی سعیِ رائگاں کا خیال آ گیا تھا۔ اس نے الماس کی نئی وارث........ نئی دریافت کا نام معلوم کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے تھے۔ مگر اسے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ ابدالی خاندان کی کوئی بھولی بسری کہانی۔ اگرچہ نئی وارث کا نام معلوم نہیں ہو سکا تھا مگر امکان کو یہ امر بے حد خوش آئند لگا تھا کہ مدِمقابل کوئی عورت ہے' اس کا خیال تھا کہ پہاڑی علاقے میں جاگیر کے حصول کا تصور کتنا ہی رومینٹک سہی' شہر میں پلنے بڑھنے والی کوئی لڑکی اسے قبول نہیں کر سکتی۔ نہ مستقلاً وہاں رہ سکتی ہے۔

بہرحال اس قضیئے کے دوران یہ طے تھا کہ وہ بار بار آتا جاتا رہے گا اور یہ بات بھی

بہت اچھی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے برابر بیٹھی ہوئی امید کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ اسے کہتے ہیں ایک پنتھ دو کاج۔ یہ معاملہ بیچ میں نہ آتا تو بھی وہ اُمید سے ملنے کے لیے بار بار آنے پر مجبور تھا۔ اس لڑکی سے ملے بغیر تو رہا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

پریمئر ختم ہونے کے بعد وہ باہر نکل آئے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ امکان نے اپنی ہنڈاایکارڈ طارق روڈ کے چاؤلنگ ریسٹورنٹ کے سامنے روکی تو اُمید کو حیرت ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ ریسٹورنٹ گیارہ بجے بند ہو جاتا ہے۔ اس نے امکان سے یہ بات کہہ بھی دی۔

"تم آؤ تو۔" امکان نے اس کے لیے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ ریسٹورنٹ تمہیں پسند تو ہے نا؟"

"ہاں' بہت زیادہ۔"

"گویا میرا اندازہ اور فیصلہ' دونوں درست تھے۔" امکان نے مسکراتے ہوئے کہا اور ریسٹورنٹ کا دروازہ دھکیل کر اُمید کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ خود بھی ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ "ریسٹورنٹ گیارہ بجے بند ہو جاتا ہے۔" اس نے اُمید سے کہا۔ "لیکن آج یہ بطور خاص ہمارے لیے اپنا معمول ترک کر رہا ہے۔"

اُمید نے بے یقینی اور استعجاب سے اسے دیکھا لیکن امکان کی یہ بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔ ریسٹورنٹ بالکل خالی تھا۔ پھر اس نے ریسٹورنٹ کے مالک کو کاؤنٹر کے عقب سے برآمد ہو کر اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کے لبوں پر خیر مقدمی مسکراہٹ تھی۔ "خوش آمدید صدیقی صاحب! آئیے.......... ڈائننگ ہال میں چلئے۔"

وہ ان دونوں کو ڈائننگ ہال میں لے آیا۔ تمام میزیں خالی پڑی تھیں۔ امید کو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ ہال بھی اس کے آفس کی طرح پھولوں سے بھرا ہوا تھا' سرخ گلابوں سے۔ ہر طرف گلابوں کی مہک تھی۔ اُمید اس دیوانگی پر حیران رہ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ امکان نے پہلے سے تیاری کی ہوئی تھی۔

ریسٹورنٹ کا مالک انہیں ایک میز پر لے آیا۔ میز پر چاروں طرف گلابوں کے دستے رکھے تھے۔ "کھانا بھجوا دوں؟ تیار ہے۔" اس نے امکان سے کہا۔

امکان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ریسٹورنٹ کا مالک چلا گیا۔ "اتنی حیران کیوں نظ

آ رہی ہو؟" امکان نے اُمید سے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں' کیا یہ ہماری آخری ملاقات ہے اتنے بہت سے پھول.........."

"دنیا میں گلاب ختم تو نہیں ہو گئے ہیں۔ ہم پھر ملیں گے۔"

اُمید ہنس دی۔ "کمال ہے! مجھے یقین نہیں آتا۔ اتنے بہت سارے پھول.......... اور یہ ریسٹورنٹ جو بطور خاص ہمارے لیے کھولا گیا ہے.......... صرف ہمارے لیے۔" اس نے کہا۔ "کیا تم لڑکیوں کو متاثر کرنے کے لیے ہمیشہ یہی کچھ کرتے ہو؟"

امکان نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر دھیمے لہجے میں بولا۔ "زندگی میں پہلے کبھی کوئی اتنا اہم لگا ہی نہیں تھا۔ بات متاثر کرنے کی نہیں ہے۔ بلکہ یہ حرکتیں تو ایسی ہیں کہ تم بھڑک کر مجھ سے دور بھی ہو سکتی ہو لیکن میں کیا کروں۔ میرے دل نے جو کہا' میں نے کر دیا۔"

اُمید کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے ایسی بات کی ہی کیوں۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو خود پر رشک آ رہا ہے۔" اُمید نے کہا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اور امکان کے درمیان کوئی برقی رو موجود ہے۔ جس نے بھولے بسرے محسوسات کو پھر سے زندہ کر دیا ہے اور وجود میں خواہشات سر اٹھا رہی ہیں.......... خوش کرنے کی' شیئر کرنے کی' چھونے کی اور محبت کرنے کی خواہشیں۔

لیکن ایسی خواہشات' ایسے محسوسات جب بھی سر اٹھائیں تو آدمی ڈرتا ہے.......... خصوصاً خواتین کہ کہیں یہ سب یک طرفہ ہی ثابت نہ ہو۔ اس وقت بھی اُمید اسی خدشے کی اسیر تھی۔ وہ سوچ رہی تھی' ایسی وجوہات بھی تو ہو سکتی ہیں جن کی وجہ سے امکان کو میری قربت کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔ بہرحال' یہ ممکن نہیں تھا کہ امکان لوگوں کے سامنے کسی خوب صورت لڑکی کے ساتھ آنے کا خواہاں ہو۔ ایسی خوب صورت لڑکیوں کی کمی تو نہیں تھی' جو خود اس کی قربت کی خواہاں ہوں۔ یہ بات بھی قرین قیاس نہیں کہ وہ اس کے تعلقات اور رابطوں سے استفادے کے لیے قریب آیا ہو۔ اگر یہ بات ہوتی تو اس ریسٹورنٹ میں اتنا اہتمام کرنے کی ضرورت کیا تھی لیکن اس میں ضمیر ہاشمی کی دلچسپی امکان کے علم میں تھی۔ گویا یہ ممکن تھا کہ وہ مسابقت کے جذبے کے تحت اس کی طرف بڑھا ہو۔ ضمیر ہاشمی پر اپنی فوقیت اور برتری ثابت کرنا چاہتا ہو۔ ضمیر ہاشمی سے ا

کی پسندیدہ چیز چھین لینا چاہتا ہو۔

اُمید کو یہ سب سوچنا برا لگ رہا تھا۔ اسے اپنے شکوک پر خود بھی شرم آرہی تھی۔ مگر وہ ماضی میں اتنی تلخیاں سمیٹ چکی تھی کہ اب شیرینی سے بھی خوف آتا تھا۔ بعض کڑواہٹیں خود کو بڑی کامیابی سے شیرینی میں چھپا لیتی ہیں۔ زبان کو بہت بعد میں ان کا اصل ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔

"مجھے تو نہیں لگتا کہ تم رشک محسوس کر رہی ہو۔" امکان نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم پریشان اور الجھی الجھی نظر آرہی ہو۔ بتاؤ تو .... بات کیا ہے؟؟"

"کوئی بات نہیں۔" اُمید نے جلدی سے کہا۔ "میں صرف یہ سوچ رہی تھی کہ تم نے اس قدر اہتمام کیوں کیا۔ یہ سب کچھ مجھے بہت اچھا لگا مگر یہ ضروری تو نہیں تھا۔"

"اب اس کا انحصار تو اس بات پر ہے کہ کسی کے نزدیک لفظ ضروری کی تعریف اور اس کا مفہوم کیا ہے۔" امکان نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "اب گلابوں کی مثال لے لو۔ تمہارے آفس کو گلابوں سے بھر دینے کے بعد مجھے یہ ضمانت مل گئی کہ میں تمہیں فون کروں گا تو مروتاً ہی سہی، تمہاری توجہ مجھے ملے گی تم مجھے ٹالو گی نہیں۔"

اُمید نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "حالانکہ میں نے مروتاً تمہیں توجہ نہیں دی۔ دیکھو.......... میں جھوٹ بولنے کی قائل نہیں ہوں۔ میں تم میں پہلے ہی سے دلچسپی لے رہی تھی۔"

"اور جہاں تک اس ریسٹورنٹ کا تعلق ہے تو اس کے سوا ایسی کون سی جگہ تھی جہاں ہم شناساؤں کی مداخلت سے بچے رہتے۔ اب یہاں صرف ہم دونوں ہیں اور سکون سے کھانا کھا رہے ہیں۔ ہیلو.......... ہائی.......... کیسی ہو.......... کیا حال ہے وغیرہ کا کوئی چکر نہیں۔ میں ہر جگہ رسمیات کا قائل نہیں۔ کچھ لوگ رسمیات سے بالاتر بھی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی رسمی گفتگو سے چڑ بھی ہونے لگتی ہے۔ اب تم اسے فضول خرچی کہہ لو.......... دکھاوا سمجھ لو، میرے لیے یہ بہت ضروری تھا.......... اہم بھی۔"

اُمید نے سر جھکا لیا۔ ان دلائل کے سامنے وہ کیا کہتی۔ کچھ کہنے کو جی بھی نہیں چاہا۔

اس گفتگو کے بعد دونوں پُرسکون ہو گئے۔ کھانا بڑی رغبت سے کھایا گیا۔ دونوں ایک

دوسرے کی قربت میں خوش اور مطمئن تھے۔ گفتگو کے لیے موضوعات کی کمی بھی نہیں تھی۔ مگر آنکھوں کی گفتگو کچھ اور ہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں بول رہی تھیں۔ اُمید ریسٹورنٹ سے اٹھی تو اگلے روز امکان کے ساتھ لنچ کا وعدہ کر چکی تھی۔

☆=========☆=========☆

لنچ خلافِ توقع بہت پھیل گیا.......... گھنٹوں پر محیط ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ دونوں ہی ملاقات کو ختم کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ گفتگو پھیلتی گئی.......... اور اس کی بے شمار سمتیں تھیں۔ مگر کوئی ان سے پوچھتا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں تو شاید وہ کچھ بھی نہ بتا پاتے۔ دیکھتے دیکھتے دوپہر، سہ پہر میں ڈھل گئی اور سہ پہر سرمئی شام کی طرف قدم بڑھانے لگی۔

بالآخر دونوں ریسٹورنٹ سے نکل آئے اور کار کی طرف بڑھ گئے۔ امکان نے اُمید کے لیے دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھنے کے بعد خود ڈرائیونگ سیٹ کی طرف چلا آیا۔ چند لمحے دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ شاید جدائی کے تصور سے اندر ہی اندر لرز رہے تھے۔ پھر امکان نے کہا۔ کلفٹن چلوگی؟؟"

اُمید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

امکان نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ دس منٹ بعد وہ کلفٹن کی حدود میں تھے۔ امکان نے گاڑی اولڈ کلفٹن والی سڑک پر ڈال دی۔ "غروبِ آفتاب کے بعد اس طرف چلیں گے۔ جب روشنیاں ہوں گی اور پلے لینڈ جگمگا رہا ہوگا۔ سمندر کے کنارے غروبِ آفتاب کا منظر تنہا دیکھنا اچھا لگتا ہے۔" اس نے کہا۔

اُمید نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ پھر شریر لہجے میں بولی۔ "لیکن تم وہاں تنہا تو نہیں ہوگے؟؟"

"صرف اپنی موجودگی میں تو آدمی تنہا ہی ہوتا ہے۔" امکان نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

اُمید نے بات آگے نہیں بڑھائی۔ امکان نے بڑی نزاکت سے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ وہ اس پر گفتگو کر کے اس کا حسن غارت نہیں کر سکتی تھی۔ امکان نے کتنی خوبصورتی سے جتا دیا تھا کہ وہ اسے خود سے الگ نہیں سمجھتا۔ مگر اُمید کو یہ بات عجیب لگی۔

کہ یہ ان کی محض تیسری ملاقات تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ بھی تو تیسری ہی ملاقات میں اس کے لیے اتنی زیادہ اپنائیت محسوس کر رہی ہے۔

وہ کار سے اترے اور ریت پر چلتے ہوئے دیوار کی طرف بڑھ گئے۔ سورج بڑی تیزی سے سمندر کی طرف جھک رہا تھا۔ اُمید کو اب خاموشی گراں محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ”کتنا حسین منظر ہے۔ پانی سنہری لگ رہا ہے۔“

”بہت حسین..........“

”مجھے خوشی ہے کہ اس طرف والے حصے میں اس کیسینو کے علاوہ کوئی عمارت تعمیر نہیں کی گئی۔ مجھے تو یہ کیسینو بھی بُرا لگتا ہے۔ ایسی تعمیرات سے قدرتی حسن متاثر ہوتا ہے۔“

”میں تو خدا کا شکر ادا کروں گا کہ تمھارے ہم خیال لوگوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے ورنہ میرا تو کاروبار ہی تباہ ہو جاتا۔“ امکان نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

”ہاں.......... تمھارا تو کاروبار یہی ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں اور کمپلیکس تعمیر کرنا.......... خصوصاً تفریح گاہیں۔ ہے نا؟ ویسے تم اس کاروبار میں کیسے آئے؟“

”کئی باتیں تھیں جنھوں نے مجھے اس کاروبار پر اُکسایا۔“ امکان نے کہا اور چند لمحے توقف کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ گردوپیش کی خوب صورتی کو آنکھوں کے راستے اپنے وجود میں اُتار رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی سنجیدگی اور سنگینی اُتر آئی تھی جو اُمید پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ ”درحقیقت زمین کی اہمیت تو ابتدا ہی میں مجھے سمجھا دی گئی تھی۔ تفریح گاہوں کی اہمیت البتہ مجھ پر بعد میں روشن ہوئی۔ تم کبھی ملک سے باہر گئی ہو؟“

”نہیں۔“ اُمید نے نفی میں سر ہلایا۔

”گویا تم نے ڈزنی لینڈ نہیں دیکھا۔ میں نے دیکھا ہے۔ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ کمرشل نکتۂ نگاہ سے بھی بہت کامیاب ہے۔ پوری دُنیا کے لوگ وہاں جانے کا خواب دیکھتے ہیں۔ ڈزنی لینڈ دیکھ کر پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ انسان بوڑھا ہو یا جوان، امیر ہو یا غریب، کھیل اور تفریح سب کی ضرورت ہے۔ وقت کیسا ہی ہو۔ اچھا ہو یا بُرا، ہر شخص کھیلنا چاہتا ہے.......... کچھ نہیں تو زندگی سے.......... تفریح کرنا چاہتا ہے بلکہ کٹھن وقت

میں پریشانیوں سے فرار کی غرض سے وہ تفریح کی زیادہ ہی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اجتماعی اور انفرادی پریشانی کے عرصے میں ساحلوں پر.......... پہاڑوں پر لوگوں کا ہجوم نظر آتا ہے۔ لوگ بے تابی سے خوب صورتی تلاش کرتے ہیں۔ ڈپریشن سے فرار کی یہی سب سے اچھی صورت ہے۔“

”اوہ.......... اور تمھارے نئے منصوبے تمام کے تمام ایسی ہی تعمیرات سے متعلق ہیں۔“ اُمید کو اس کے متعلق ایک خبر یاد آگئی۔ ”میرا خیال ہے، تم ایسے چھ پروجیکٹس پر کام کر رہے ہو؟“

”چھ نہیں، سات۔“ امکان بے فکرے بچّوں کی طرح ٹانگیں جھلا رہا تھا۔ سورج دور اُفق پر پانی میں اترنے کو پر تول رہا تھا۔

امکان نے اچانک ہی کہا۔ ”آخر ہمیشہ میرے ہی متعلق گفتگو کیوں ہوتی ہے۔ تم مجھے اپنے اور اپنی زندگی کے بارے میں کیوں نہیں بتاتیں؟“

”میری زندگی اتنی دلچسپ بھی تو نہیں ہے۔“

”ممکن ہے، تمھارے لیے نہ ہو۔ میرے لئے تو ہے۔“ امکان نے کہا اور بڑی نرمی سے اُمید کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میں تمھارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہوں۔“

”کیا جاننا چاہتے ہو؟“

”یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم اپنی نزاکت اور نسوانیت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں اتنے بڑے عہدے تک کیسے پہنچ گئیں؟“ امکان نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی اچانک تمھاری آنکھوں سے بے اعتمادی اور چوکنا پن کیوں جھلکنے لگتا ہے؟ میں تمھاری ازدواجی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔“ اُس کے ہاتھ اُمید کے بالوں کو سہلانے لگے۔ ”اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا ڈوبتے سورج کی کرنیں ہمیشہ اسی طرح تمھارے بالوں میں اُتر کر گم ہو جاتی ہیں۔ تمھارے بالوں کی رنگت اسی طرح تبدیل کر دیتی ہیں۔ کیا تمھاری ممتا کے ہونٹ بھی تمھارے جیسے ہی تھے.......... اور یہ کہ کیا میری طرح ہر مرد تمھیں ایک نظر دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا ہے، کیا میری طرح ہر ہاتھ میں تمھیں چھونے کی خواہش مچلنے لگتی ہے، ہر دل کی دھڑکن میں موسیقیت رچ جاتی ہے، ہر مرد کی سانسیں پُکار بن جاتی ہیں؟“

اس کے لہجے میں محبت کا عجیب جادو تھا جو سرچڑھ کر بولا۔ اُمید جو مزید دُکھوں سے بچنے کے لیے تعلقات کے باب میں احتیاط کا دامن ہمیشہ مضبوطی سے تھامے رکھتی تھی، جذبات کے اس تند اور منہ زور دریا میں تنکے کی طرح بہہ گئی۔ رگ و پے میں عجیب سی سرشاری کروٹیں لے رہی تھی۔ امکان کی قربت کے سوا ہر احساس مٹ گیا۔ اس کا سر خود بہ خود امکان کے کندھے پر جاٹکا۔ "کیا تم ہمیشہ.......... ہر لڑکی سے ایسی ہی خوبصورت باتیں کرتے ہو؟" اس نے خواب ناک سرگوشی میں پوچھا۔

"خوب صورت باتیں! میں تو عجزِ بیان کا اعتراف کر رہا ہوں۔ جذبوں کی خوب صورتی کے اظہار کے لیے بھونڈے لفظوں کے سوا یہاں رکھا ہی کیا ہے۔"

دونوں نے سر اُٹھا کر افق کی سمت دیکھا جہاں آسمان اور سمندر گلے مل رہے تھے۔ سورج کمر کمر پانی میں اُتر رہا تھا.......... بلکہ اُترنے کا وہ عمل بہت تیز رفتار تھا۔ پیچھے سمندر کے سینے پر اندھیرا پھیل رہا تھا۔ امکان نے گہری سانس لی اور اس کا ہاتھ فضا میں بلند کرکے اس پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ اس نازک حسین ہاتھ کے ارتعاش نے اس کے پورے وجود کو مرتعش کردیا۔ چند لمحے بعد اُس نے سر اٹھا کر اُمید کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ "رات کا کھانا بھی میرے ساتھ کھاؤ۔"

"نہیں۔" اُمید نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "رات کا کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ گے کسی بھی ریسٹورنٹ میں نہیں.......... میرے گھر پر۔ آج میرا کھانا پکانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

☆=========☆=========☆

اُمید نے مارکیٹ کے سامنے گاڑی رکوائی۔ "مجھے کچھ خریداری کرنی ہے۔" اس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کیا کھاؤ گے؟"

"جو تم پکا دو۔" امکان نے کہا اور خود بھی نیچے اُتر آیا۔ "میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔ دیکھوں.......... کیسی خریداری کرتی ہو تم؟"

دونوں مارکیٹ میں چلے آئے۔ اُمید نے گوشت خریدا پھر سبزی۔ امکان مسکراتی آنکھوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ سامان خرید کر وہ نکل آئے۔ اس بار گاڑی اس بلڈنگ کے سامنے رُکی جس میں اُمید کا فلیٹ تھا۔

فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اُمید کچن میں گھس گئی۔ "میں تمھارے لیے چائے بناتی ہوں۔" اس نے امکان سے کہا۔ "کھانا تیار ہونے میں ایک ڈیڑھ گھنٹا تو لگے گا ہی۔"

امکان نے سر کو تفہیمی جنبش دی، پھر بولا۔ "میں کھانا پکانے میں تمھاری مدد کروں گا۔"

"جی نہیں، کھانا کوئی عمارت نہیں ہے۔" اُمید نے شوخی سے کہا۔ "ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کچھ پڑھو۔ وہاں کئی میگزین رکھے ہیں۔"

"لیکن میں.........."

اُمید نے اس کی بات کاٹ دی۔ "جناب.......... میں اپنے کام میں کسی کی مداخلت قبول نہیں کرتی۔"

امکان خاموشی سے ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا۔ اُمید نے چائے کا پانی چولہے پر چڑھا دیا اور پھر کھانا پکانے کی تیاریوں میں لگ گئی۔ چند لمحے بعد امکان نے اُسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ کوئی میگزین ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ اُس نے کچن کے دروازے کے باہر ایک کرسی بھی لاکر رکھ لی تھی۔ اُمید نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

"یہاں بیٹھ کر میگزین پڑھنے کی اجازت تو ملے گی نا؟" اس نے بچوں کے سے انداز میں پوچھا۔

اُمید کو ہنسی آگئی۔ "چلو.......... تم بھی کیا یاد کرو گے۔ اجازت ہے لیکن باتیں کرنا منع ہے۔"

"منظور۔" امکان نے خوش ہوکر کہا۔ پھر وہ کرسی پر بیٹھ کر ورق گردانی کرنے لگا۔

اُمید کام میں لگ گئی۔ مگر اس کا ذہن امکان کے بارے میں سوچنے میں مصروف تھا۔ اس وقت امکان کی شخصیت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ، باوقار اور پُراعتماد مرد کہیں کھو گیا تھا جس سے وہ بیگم سہراب کے گھر کی پارٹی میں پہلی بار ملی تھی۔ اس وقت تو وہ اس چھوٹے سے بچّے کی طرح لگ رہا تھا جو برسوں گھر سے دور رہنے کے بعد واپس آیا ہو اور اب گھر سے چند لمحوں کے لیے دور رہنے پر بھی تیار نہ ہو۔

اُمید نے چائے بنا کر اسے دی اور پھر کھانا پکانے میں مصروف ہوگئی۔ امکان بہ ظاہر چائے پینے اور میگزین پڑھنے میں مگن تھا مگر اُمید جانتی تھی کہ وہ ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ

رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ پلٹ کر اسے دیکھتی' وہ تیزی سے میگزین پر نظریں جما کر بیٹھ جاتا۔ اس کا وہ انداز بھی چھوٹے بچوں کا سا تھا۔ ایک بار تو اس عمل کے دوران دونوں کی نگاہیں بھی مل گئیں۔ اُمید کو اس کی آنکھوں میں معصوم سی چمک نظر آئی۔ پھر امکان نے جھینپ کر نظریں جھکالیں۔ "میں تم سے باتیں نہیں کر رہا ہوں۔" اُس نے میگزین پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

"کیے تو جا رہے ہو مسلسل۔" اُمید نے کہا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اُس کے رخساروں میں دبی دبی سی مہکتی آگ دہک اٹھی ہے۔

چلو' اب ہاتھ دھو لو اور ڈرائنگ روم میں چلو۔" کوئی ایک گھنٹے بعد اُمید نے امکان کو مخاطب کیا۔ "کھانا تیار ہے۔ میں لا رہی ہوں۔"

"کمال ہے! تم نے تو بہت جلدی کھانا پکالیا۔" امکان نے حیرت سے کہا۔

"نہیں تو۔ خاصا وقت لگا ہے۔ دراصل پکانے کی عادت ہی نہیں رہی۔" اُمید نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"صرف اپنے لیے کھانا کون پکائے۔ پھر تھکی ہاری گھر پہنچتی ہوں میں۔" اُمید نے کہا۔ مگر دل ہی دل میں وہ سوچ رہی تھی کہ مجھے امکان کی شخصیت میں تبدیلی تو نظر آگئی مگر اپنے اندر رُونما ہونے والی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا۔ آج کتنے برسوں کے بعد میں نے کھانا پکایا ہے اور کتنے شوق سے پکایا ہے۔ میرے اندر کتنے جذبے کتنی امنگیں گھُٹ رہی تھیں.......... اور اب یہ اجنبی تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح آیا ہے تو سب کچھ زندہ سا ہو گیا ہے.......... میں بھی جیسے پھر سے جی اُٹھی ہوں..........

دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کبھی کبھی نظریں ایک ساتھ اٹھتیں' ملتیں اور جھک جاتیں۔ مگر وہ خاموشی بے حد بلیغ تھی۔ اَن کہے فسانے کہتی ہوئی خاموشی۔

کھانے کے بعد امکان نے کافی کی فرمائش کی۔ اُمید کافی بنا لائی۔ کافی پینے کے دوران اچانک امکان نے کہا۔ "ایک بات کہوں۔ مانو گی؟"

"ہاں.......... ضرور۔" اُمید نے بلا جھجک کہا۔

امکان نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ کیسی عجیب لڑکی ہے۔ اس نے سوچا۔ "خوا

مخواہ وعدہ کر لیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ کوئی ناقابلِ تعمیل فرمائش بھی ہو سکتی ہے۔ اسے بے باکی کہا جائے.......... معصومیت یا اعتماد.......... اعتماد بھی مجھ پر.........." اُمید نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں سایہ سا لہرا گیا۔ شاید اُس نے بھانپ لیا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

"میں تمہیں اپنا گھر دکھانا چاہتا ہوں۔" امکان نے آہستہ سے کہا۔

"گھر! میں نے تو سُنا ہے' تم جب بھی یہاں آتے ہو' ہوٹل میں قیام کرتے ہو۔" اُمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں' یہ درست ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میرا کوئی گھر ہی نہیں۔"

"تو پھر تم گھر میں کیوں نہیں ٹھہرتے؟"

"میں شاید اسے گھر غلط کہہ رہا ہوں۔" امکان کے لہجے میں عجیب سا دُکھ اُتر آیا۔ "وہ.......... وہ تو بس مکان ہے کہ جہاں آدمی تنہا ہو' وہ جگہ گھر تو نہیں ہو سکتی مگر اب میں سوچتا ہوں' ممکن ہے' وہ گھر ہی ہو جائے۔" اس نے توقف کیا پھر پوچھا۔ "چلو گی نا؟" لہجہ پھر بچوں کا سا تھا۔ معصومیت اور التجا سے چھلکتا ہوا۔

"کیوں نہیں' ضرور چلوں گی۔"

"تو پھر چلو۔" اس نے بے صبرے پن سے کہا۔

"چلو۔" اُمید بھی اٹھ گئی۔

☆=========☆=========☆

وہ مکان کیا' بے حد وسیع و عریض بنگلا تھا۔ امکان نے گیٹ پر کار روکی اور ہارن بجایا۔ چند لمحے بعد گیٹ کا ضمنی دروازہ کھلا اور چوکیدار نے جھانکا۔ امکان کو دیکھتے ہی وہ گڑبڑا کر باہر نکل آیا اور زوردار سیلوٹ جھاڑ دیا۔ "صاحب آپ..........؟"

"ہاں' میں نہیں آسکتا کیا؟ گیٹ کھولو۔"

"ابھی لو صاحب۔"

چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ امکان کار اندر لے گیا اور پورچ میں لے جا کر پارک کردی۔ چوکیدار نے گیٹ مقفل کیا اور اپنی کوٹھری میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھا۔ اس نے گچھا امکان کے ہاتھوں میں تھمایا اور پوچھا۔

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں صاحب؟"

"نہیں، تم جاکر آرام کرو۔" امکان نے نرم لہجے میں کہا پھر اُس نے صدر دروازہ کھولا اور احترام آمیز لہجے میں اُمید سے کہا۔ "چلو، میں چاہتا ہوں کہ میرے گھر میں بھی اُمید کی روشنی گھر کرلے۔" اس کے لفظوں میں بے تکلفی تھی۔

اُمید کو ایسا لگا جیسے وہ کوئی وی آئی پی ہے اور کسی اہم عمارت کا افتتاح کرنے والی ہے۔

امکان نے اندر داخل ہوتے ہی روشنی کردی۔ پھر وہ اُمید کو اپنے مکان کا ایک ایک گوشہ دکھاتا پھرا۔ اس کے لہجے سے چھلکتی چاہت امید کو احساس دلاتی تھی کہ امکان نے بڑی محبت سے اس مکان کو تعمیر کرایا ہے۔ وہ اندر سے بھی بے حد خوب صورت تھا۔ کیوں نہ ہوتا...... ایک ماہر تعمیرات کا اپنا مکان تھا۔ آرائش بھی لاجواب تھی۔ کہیں گرد کا نشان بھی نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہر روز صفائی کی جاتی ہے۔

نچلی منزل کے بعد وہ اوپری منزل کی طرف بڑھ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک آراستہ و پیراستہ بیڈ روم میں کھڑے تھے۔ امکان نے آگے بڑھ کر لان کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں کھول دیں۔ کمرے میں حریری پردوں کی ریشمی سرگوشیاں گونجنے لگیں۔

"یہ میرا بیڈ روم ہے۔" امکان نے فخریہ لہجے میں کہا۔ اُمید نے کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ کمرے کی آرائش خوش ذوقی کا اظہار کر رہی تھی۔ ایک طرف ڈبل بیڈ تھا۔ بیڈ کے ساتھ سائیڈ ٹیبل تھی۔ دوسری جانب ملبوسات کی الماری تھی۔ بیڈ کے سامنے والی دیوار پر ایک پینٹنگ میں ایک آٹھ دس سالہ لڑکا چہرے پر افسردگی کا تاثر لیے موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ پہلی نظر میں تو اُمید کو پتا ہی نہ چلا۔ پھر بغور دیکھنے پر اُسے تصویر کا اصل حسن نظر آیا۔ لڑکے کی ایک آنکھ کے نیچے آنسو کی لکیر تھی۔ لگتا تھا، کچھ دیر پہلے ضبط کی بے پناہ کوشش کے باوجود وہ چپکے چپکے رویا ہے اور اب اُس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔ مگر اس کے چہرے سے اب بھی ضبط کا اظہار ہو رہا ہے۔

اُمید سحر زدہ سی اس پینٹنگ کو دیکھتی رہی۔ بالآخر اُس کے لب ہلے۔ "یہ تصویر......"

"یہ مجھے بہت عزیز ہے۔" امکان نے اُس کی بات پوری نہ ہونے دی۔ "یہ مجھے یاد

دلاتی ہے کہ کبھی میں ایسا ہی تھا۔ میں نے خود کو اپنی آنکھوں سے اِس حال میں کبھی نہیں دیکھا۔ کوئی بھی نہیں دیکھ پاتا خود کو۔ یہ تصویر دیکھ کر مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے کیسے اذیت ناک دن گزارے ہیں۔ مجھے یاد ہے، میں بچپن میں بھی کبھی چیخ چیخ کر نہیں رویا۔ کوئی تکلیف پہنچتی تو ضبط کرتا رہتا۔ حلق جیسے آنسوؤں سے بھر جاتا۔ سینہ چٹخنے لگتا اور میں موقع کا انتظار کرتا۔ موقع ملتے ہی میں کسی گوشے میں چُھپ کر چپکے چپکے بے آواز روتا۔ عام طور پر ایسا موقع اپنے بستر پر ہی ملتا تھا...... رات کے وقت۔ بعض اوقات میں پورا دن آنسوؤں کا بوجھ اٹھائے پھرتا رہتا......"

وہ خود کار انداز میں بولے جارہا تھا۔ اُمید اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اُس وقت بھی اُس آٹھ سالہ لڑکے کی طرح لگ رہا ہے۔ جو اپنے سینے پر آنسوؤں کا بوجھ اُٹھائے ضبط کے جہنم سے آہستہ آہستہ گزر رہا ہو۔ اس کے چہرے پر بلا کا کرب تھا مگر لہجہ بے تاثر تھا۔

"...... مجھے پہلی بار یہ پینٹنگ نظر آئی تو لگا، پچیس سال پہلے کے امکان سے ملاقات ہوگئی ہے۔ میں نے اسے خرید لیا اور اپنے بیڈ روم میں آویزاں کردیا۔"

"مگر تم یہاں رہتے بھی نہیں۔ کیوں؟" اُمید نے پوچھا۔

"تنہائی سے ڈرتا ہوں۔"

"تنہائی تو ہوٹل میں بھی ہوتی ہوگی؟"

"ہاں، مگر وہ ہوٹل ہے اور یہ گھر۔ گھر میں تنہا رہنا بہت بڑا عذاب ہوتا ہے۔" اُس نے بڑی سادگی سے کہا۔ پھر پوچھا۔ "تمہیں اچھا لگا میرا مکان؟"

"بہت اچھا۔ اور امکان...... مکان کو گھر ہونے دیر نہیں لگتی۔"

"شاید...... شاید......" وہ کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر کچھ توقف کے بعد محجوب انداز میں بولا۔ "اُمید...... میری ایک بات اور مان لو۔"

اُمید نے نظریں اٹھا کر اس پختہ کار مرد کو دیکھا جس نے ایک بچے کی شخصیت اوڑھ لی تھی۔ "بولو...... کیا بات ہے؟" اُس نے بے حد شیریں لہجے میں پوچھا۔

"میں نے اپنے گھر میں کبھی ایک رات بھی نہیں گزاری۔ میں آج رات اس گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔"

"تو یہ کون سی مشکل بات ہے۔"

"بہت مشکل ہے۔ تم نہیں سمجھتیں۔ میں یہاں تنہا نہیں رہ سکتا.........."

وقت جیسے ٹھہر گیا۔ اُمید ساکت آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔

"تم......... آج رات یہیں رہ جاؤ۔"

اُمید اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "ٹھیک ہے۔"

وہ بچوں کی طرح خوش ہو گیا۔ "ٹھیک ہے، تم یہاں.......... اسی کمرے میں سونا۔"

"لیکن یہ تمہارا بیڈ روم ہے۔"

"میری خواہش ہے کہ تم یہیں سوؤ۔ میں خود کو بہت اچھی طرح ٹٹولنا چاہتا ہوں.......... بہت کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

اُمید خاموش رہی۔ وہ اس کی بات سمجھ گئی تھی وہ خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔ سب کچھ بہت تیزی سے ہو رہا تھا۔ خود کو سمجھنے کی، خود سے گفتگو کرنے کی مہلت ہی نہیں مل رہی تھی۔ وہ بھی خود کو پوری طرح ٹٹولنا چاہتی تھی۔

"آؤ.......... تمہیں ٹیرس دکھاؤں۔" امکان نے کہا۔

ٹیرس کے خواب ناک ماحول میں وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے خاموش کھڑے رہے۔ وقت پر لگا کر اُڑتا رہا۔

کچھ دیر بعد امکان نے کہا۔ "چلو.......... اب سو جاؤ۔"

اُمید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اندر چلے آئے۔ بیڈ روم کے دروازے پر امکان رکا۔ اُس نے جھک کر اُمید کی پیشانی چوم لی۔ "میں برابر والے کمرے میں ہوں، جاؤ.......... آرام سے سو جاؤ۔ شب بخیر۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور برابر والے کمرے کی طرف چل دیا۔ دروازہ کھولنے کے بعد اس نے پلٹ کر اُمید کو دیکھا۔ جو اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

"شب بخیر۔" اُمید نے کہا اور دروازہ کھول کر کمرے میں چلی آئی۔ دروازہ لاک کرتے وقت اُسے کچھ خیال آیا۔ اُس نے دروازے کو غیر مقفل ہی رہنے دیا۔ وہ اس گھر میں رات گزار رہی تھی۔ یہ اعتبار کی انتہا تھی۔ اُس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ امکان اُس کی اس رضامندی کو کوئی بھی مفہوم پہنا سکتا ہے صرف اس لیے کہ وہ، جس نے دل کے

معاملات میں صرف خدشے پالنا سیکھا تھا اور وہ خدشے ہی جیسے اس کا دفاعی حصار تھے، ہر خدشے، ہر وسوسے سے پاک ہو گئی تھی۔ تو جہاں آدمی اعتبار کی انتہا کر دے، وہاں ایسی چھوٹی سی بے اعتباری بے محل ہی تو ہو گی۔

اُس نے لائٹ آف کی نائٹ بلب کا سوئچ آن کیا اور بستر پر آلیٹی۔ چند لمحے بعد اس کی بصارت مدھم روشنی سے ہم آہنگ ہو گئی۔ اُس کا ذہن مصروف تھا۔ اُس نے ذہن سے ہر سوچ جھٹک کر سو جانے کی کوشش کی، مگر نیند پر اُس کا اختیار نہیں تھا۔ وہ کروٹیں بدلنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکی۔ یہ بات نہیں کہ ماحول کی اجنبیت کی وجہ سے نیند نہ آ رہی ہو۔ حالانکہ وہ اس معاملے میں بہت حساس تھی۔ کسی اجنبی جگہ پر کبھی اسے نیند نہیں آتی تھی۔ نامانوس بستر اُس کے لیے کانٹوں کی سیج بن جاتا تھا۔ مگر یہاں بات اور تھی۔ یہ بستر اُسے نامانوس نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ وہ تو اُسے خوش آمدید کہتا.......... پُرسکون انداز میں تھپکیاں دیتا معلوم ہو رہا تھا۔ کمرے کی فضا میں عجیب ناقابلِ بیان ساسکون تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے اس کمرے میں رہتی آئی ہے۔

لیکن اُس کے اپنے اندر کا حال عجب تھا۔ وہ سوچنا چاہتی تھی لیکن سوچ نہیں پا رہی تھی۔ دل میں عجیب شوریدہ سر جذبے جاگ اٹھے تھے اور تند موجوں کی طرح ساحل پر سر پٹخ رہے تھے.......... دل کے ساحل پر۔ اور ہر تیز موج کچھ سیپیاں، کچھ کوڑیاں چھوڑ کر پلٹ رہی تھی۔ اُس کا وجود جیسے ایک مہکتی پکار بن کر رہ گیا تھا۔ وہ خود کو آزمائش میں بھی نہیں ڈالنا چاہتی تھی مگر اس کا جی چاہتا تھا کہ ان لمحوں میں امکان اُس کے قریب ہو.......... بے حد قریب، اور وہ اسے بلا بھی نہیں سکتی تھی۔

ایسے میں اُسے دروازے پر چاپ سی محسوس ہوئی۔ اُس نے سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کا لٹو واضح طور گھوم رہا تھا۔ اُس کے دل کی دھڑکنیں پاگل ہو گئیں۔ جیسے بُلاوا بن گئیں۔ مگر دروازہ نہیں کھُلا۔ پھر اُسے واضح طور پر جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔

ایک لمحے کے لیے اُس کے وجود میں مایوسی سی تیر گئی۔ پھر اُسے امکان پر بے تحاشا پیار آیا۔ وہ صرف یہ دیکھنے آیا تھا کہ اُسے اُس پر اعتماد ہے یا نہیں۔ اگر دروازہ بند ہوتا تو وہ نہ جانے کیا سوچتا۔ اُس کے جذبات مجروح ہوتے۔ اب وہ کس قدر خوش اور مطمئن

واپس گیا ہو گا۔

پھر وہ خوش ہو گئی۔ امکان نے اپنے عمل سے یہ بھی ثابت کر دیا تھا کہ اُس نے اِس کی سپُردگی کا غلط مطلب نہیں لیا ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ اُس نے امکان پر اعتماد کر کے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

رات دبے قدموں صبح کی طرف آہستہ آہستہ پیش قدمی کرتی رہی۔ اُمید کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر وہ اُٹھی۔ اُس نے لائٹ آن کی اور بچے کی پینٹنگ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہ تصویر اُس کے ذہن میں عجیب سے احساسات جگاتی رہی۔ ہر شخص کی پسند' ناپسند کا کوئی پس منظر ہوتا ہے۔ ہر پسند ناپسند اپنے پیچھے اپنے مالک کے کئی شخصی بھید چھُپائے ہوتی ہے۔ وہ تصویر بھی کئی بھید عیاں کر رہی تھی۔ امکان کے اندر کی شخصیت کو متعارف کرا رہی تھی۔ ثابت ہو رہا تھا کہ بعض اوقات کسی میچور مرد میں بھی کہیں کوئی ناآسودہ بچہ چھُپا ہوتا ہے۔

وہ تصویر کو بغور دیکھتی رہی۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا' جیسے امکان بچپن میں تصویر والے لڑکے جیسا ہی رہا ہو گا۔ اب وہ یہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ دونوں کے درمیان مشابہت ہے بھی یا نہیں۔ ممکن ہے' یہ اُس کا اپنا تاثر ہو۔

وہ کچھ دیر تصویر کے سامنے کھڑی رہی۔ پھر اسے ایسا لگا جیسے لڑکے کا چہرہ غائب ہو گیا ہے اور اس کی جگہ امکان کے چہرے نے لے لی ہے لیکن وہ اس امکان کا چہرہ نہیں تھا جسے اس نے دیکھا تھا۔ وہ تو ماضی کے عقب سے جھانکتا ہوا دھندلے نقوش والا چہرہ تھا۔

پہلی بار اسے عجیب سا احساس ہوا۔ یہ بات وہ پہلے کبھی نہیں سمجھ سکی تھی۔ عورت صنفِ نازک ہونے کے ناتے مرد سے تحفظ کی طلب گار ہوتی ہے تو مرد بھی عورت میں اپنے لیے تحفظ تلاش کرتا ہے۔ دونوں کی نوعیت البتہ مختلف ہوتی ہے۔ عورت مرد سے اپنے تحفظ کے لیے ایک مکان طلب کرتی ہے اور مرد اس سے متقاضی ہوتا ہے کہ وہ اس مکان کو گھر کر دے۔ مرد عورت سے ممتا بھری اس نرمی کی طلب کرتا ہے جو اس کے پاس نہیں ہوتی۔

اس لمحے اُمید کا جی چاہا.......... شدت سے جی چاہا کہ وہ امکان کو وہ تحفظ فراہم کرے جو وہ اپنی سختی اور مضبوطی کی وجہ سے اُس سے کھُل کر طلب نہیں کر پا رہا ہے۔

اس کے اندر کوئی منہ زور جذبہ پوری شدت سے امڈ رہا تھا۔ اسے بہالے جانا چاہتا تھا۔ اس کا جسم لرزنے لگا۔

وہ تصویر کے سامنے سے ہٹی اور کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر یونہی وہ الماری کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ الماری کے آئینے میں اسے اپنا عکس نظر آیا۔ اپنی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اسے نہ جانے کیوں خود سے ہی حجاب آ گیا۔ اس نے بے خیالی میں الماری کا پٹ کھولا۔ الماری میں ہینگرز پر امکان کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ شب خوابی کا لباس دیکھ کر اسے خیال آیا کہ وہ یہاں ٹھہرنے کے ارادے سے نہیں آئی تھی۔ لہٰذا شب خوابی کے لباس سے محروم تھی۔ جو کپڑے وہ پہنے ہوئے تھی' وہ پہن کر سونے کی صورت میں کپڑے بری طرح مسک جاتے' اس نے الماری کا پٹ بند کر کے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ ابھی کپڑوں کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ اس نے پٹ دوبارہ کھولا اور امکان کا شب خوابی کا لباس نکال لیا۔ لباس سے مخصوص مہک اٹھ رہی تھی۔ شاید وہ امکان کے جسم کی مہک تھی۔

اس نے الماری بند کی اور ملحقہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے کپڑے بدلے' اپنا لباس تہہ کیا اور پھر الماری کی طرف چلی آئی۔ اپنے کپڑے الماری میں رکھنے کے بعد اس نے اپنے عکس کو بغور دیکھا اور کھِل کھِلا کر ہنس دی۔ بش شرٹ اس کے جسم پر قمیض کی طرح آئی تھی۔ مگر آستینیں بہت لمبی تھیں پاجامے کا بھی یہی حال تھا۔ اس نے جُھک کر پائنچے موڑ لیے۔ اب اسے اپنے جسم سے امکان کی مہک اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ شرما گئی۔

آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا.......... بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلنے سے کیا فائدہ۔ اس نے بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا اور ٹیرس کی طرف چل دی ٹیرس چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ وہ پورے چاند کی رات تھی.......... اور اس کی اپنی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کے اپنے وجود میں بھی جیسے چودھویں کے چاند کا پھول کھِل اٹھا تھا۔

اسے امکان کی آمد کا پتا بھی نہ چلا۔ وہ تو اس وقت چونکی جب امکان نے عقب سے بش شرٹ کی لٹکتی ہوئی آستینیں تھام کر انہیں نرمی سے جھٹکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ بھی شب خوابی کے لباس میں تھا اور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"ادھر مڑو......... میری طرف۔ میں تمہیں پوری طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔" امکان نے بوجھل آواز میں کہا۔

وہ شرمائی شرمائی سی پلٹ گئی۔ اب امکان اسے بھرپور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اچھی لگ رہی ہو......... بہت اچھی لگ رہی ہو۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ظاہر ہے' ان کپڑوں میں تو مجھے........." اُمید نے شرمیلے لہجے میں کہا لیکن اس سے بات پوری نہیں کی گئی۔

"مجھ کو آخر پہنے کون۔ میں ترے تن کا کپڑا ہوں۔" امکان نے ناصر کاظمی کا شعر یوں سنایا جیسے گفتگو کر رہا ہو۔

"مجھ میں دیا جلائے کون۔ میں ترا خالی کمرا ہوں۔" اُمید نے بھی ناصر کاظمی کے شعر کے ذریعے ہی جواب دیا۔

امکان نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "میں اس لیے آیا تھا کہ مجھے تمہارے ہونے کا یقین درکار تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم میرا خواب تو نہیں۔"

اُمید کہنا چاہتی تھی کہ میں خواب بھی ہوں اور تعبیر بھی مگر اس کی زبان کھل نہ سکی۔ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ "مجھے......... نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں.........میں......... مجھے........."

"خوف آ رہا تھا۔" امکان نے اس کی بات پوری کر دی۔ اس کے لہجے میں بے پناہ عتماد تھا۔

وہ سناٹے کے عالم میں اسے دیکھتی رہی۔ اس نے نہ جانے کیسے اس کے دل کی بات جان لی تھی۔ "کیسے.........؟"

"میں نے کیسے جان لیا۔" امکان نے پھر اس کا جملہ پورا کر دیا۔ "تم کیا سمجھتی ہو۔ جو کچھ ہو رہا ہے' صرف تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔ نہیں اُمید......... ایسا نہیں۔ میں بھی تمہارے محسوسات میں شامل ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی مرحلے سے گزر رہے ہیں۔"

"مجھے......... مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم بھی........."

"اب تو پتا چل گیا نا۔ دیکھو اُمید......... آنے والے کل کو ہم میں سے کوئی بھی نہیں روک سکتا......... اور جب وہ آئے گی تو میں چلا جاؤں گا۔ مجھے جانا ہو گا۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"ہم دونوں کے حصے میں پھر تنہائی اور اداس راتیں آئیں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ آج کی رات بھی ان راتوں میں سے ایک ہو۔"

"میں بھی نہیں چاہتی کہ ایسا ہو۔" اُمید نے کہا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ آنے والی تنہا اور اداس راتیں اتنی دشوار بھی ثابت نہیں ہوں گی بشرطیکہ اس کے پاس خوشگوار یادوں کا زادِ سفر موجود ہو۔ امکان کی قربت کی یادوں کے سہارے تو وہ کٹھن وقت گزار سکتی تھی۔

"تو اس کی یہی صورت ہے کہ میرا ہاتھ تھامے ساری رات اس ٹیرس پر کھڑی رہو۔"

اُمید کو اچانک خیال آ گیا۔ "ابھی تم نے خوف کی بات کی تھی۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اور تم ایک ہی مرحلے سے گزر رہے ہیں۔"

"تو تمہیں کوئی شک ہے اس میں؟"

"نہیں' شک تو نہیں ہے مگر میں مکمل یقین چاہتی ہوں۔" اُمید نے کہا۔ "یہ بتاؤ' تمہیں کس بات سے خوف آ رہا ہے؟"

"خود سے' اور تمہیں؟"

"مجھے بھی۔" اُمید نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں مجھ سے خوف نہیں تھا؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"تم سے خوف کیوں ہوتا۔ ہونا ہوتا تو میں یہاں رکتی کیوں......... بلکہ آتی ہی کیوں؟"

"اُمید......... میں اس اعتماد پر تمہارا شکر گزار ہوں۔ اسی لیے تو مجھے خود سے خوف آ رہا تھا مگر اب ہر خوف ڈھل گیا ہے۔ اب تم بھی خوف زدہ نہیں ہو نا؟"

"نہیں۔"

"بس......... اب ہم خاموش رہیں گے......... صبح تک۔"

"تم میرا ہاتھ تھامے رہنا۔"

رات کے قدم تیزی سے صبح کی منزل کی طرف اٹھ رہے تھے۔ لمحوں کے اڑتے ہوئے جگنوؤں کی رفتار بڑھ گئی تھی۔

صبح ہوئی تو انہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں' رات بھر جاگنے کے باوجود کوئی تھکن نہیں تھی۔ وہ بے حد شگفتہ اور ترو تازہ نظر آرہے تھے۔

"میں.......... میں فیصلہ نہیں کرپا رہا ہوں۔" امکان نے کہا۔

"کیسا فیصلہ؟ کس بارے میں؟"

"میرا وجود دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک حصہ چاہتا ہے کہ میں تم پر اپنے نام کا لیبل لگا دوں.......... تمہیں اپنے لیے مخصوص کر لوں۔ دعویٰ کروں کہ تم میری ملکیت ہو۔" امکان نے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ "اور دوسرا حصہ مجھے حقیر ہونے کا احساس دلاتا ہے.......... عاجزی پر مجبور کرتا ہے۔ یہ احساس میرے لیے نیا ہے۔ میں پہلی بار اس سے آشنا ہو رہا ہوں۔"

"میرا بھی یہی حال ہے۔" اُمید نے کہا۔ اس کے ذہن میں اس مسئلے کا حل موجود تھا مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ وہ کہنا چاہتی تھی' پہلے حصے کی تشفی کے لیے تم میرے وجود پر اپنے نام کی مہر لگا دو اور دوسرے حصے کی تشفی کے لیے اپنا وجود میرے نام کر دو۔ تکمیل اسی کو تو کہتے ہیں۔ میں تو یہی کرنا چاہتی ہوں.......... اور شاید کروں گی بھی۔

مگر وہ خاموش رہی۔ جدائی کی گھڑی تیزی سے قریب آرہی تھی۔

☆==========☆==========☆

الماس ابدالی کے بھیجے ہوئے کاغذات کا پیکٹ اُمید کو مل چکا تھا۔ اس میں شجرہ بھی تھا۔ اس وقت وہ بیٹھی شجرے کا جائزہ لے رہی تھی لیکن اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہر رشتے اور ہر شاخ کے متعلق تحقیق.......... اور ان کی تصدیق کرتی۔ مگر اسے اتنا پتا چل گیا کہ اس کی الماس ابدالی سے رشتے داری ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ اگرچہ رشتہ دور کا تھا۔ خاندان سے باہر ہونے والی شادیوں نے رشتوں کے درمیان فاصلہ بڑھا دیا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ اُمید نے سر اٹھائے بغیر پکارا۔ "یس؟"

دروازہ فوراً ہی کھلا۔ اس کی سیکریٹری سیما کمرے میں آئی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ "ہاشمی صاحب آئے ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ انہیں کیا جواب دوں۔"

"ضمیر ہاشمی؟ یہاں؟" اُمید خود بھی حیران رہ گئی۔

"جی.......... میں.........." سیما کچھ کہنے والی تھی۔ وہ بیرونی کمرے کی جانب کھلنے والے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور اب وہ دروازہ کھل رہا تھا۔ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور ایک طرف ہٹی۔

دروازہ کھلا اور ضمیر ہاشمی اندر آیا۔ اُمید تیزی سے اپنی کرسی سے اٹھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بن بلائے مہمان کے ساتھ کس طرح پیش آئے "ہیلو۔" بالآخر اس نے کہا۔ "آپ کو مجھے مطلع کر دینا چاہیے تھا کہ آپ آرہے ہیں۔" اس کے لہجے میں سرد مہری تھی۔

ضمیر ہاشمی کمرے کے وسط میں رک گیا۔ اسی وقت اس کی نظر کھانے کی پلیٹوں پر پڑی۔ "اوہ.......... معذرت خواہ ہوں۔ میں نے تمہیں لنچ کے دوران ڈسٹرب کیا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں کھانا کھا چکی ہوں۔" اُمید نے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ ضمیر ہاشمی کو آفس میں داخل ہوتے دیکھتے ہی اس کی بھوک اُڑ گئی تھی۔ اس نے برتن ایک طرف ہٹائے اور سیما سے کہا۔ "رشید کو بھیج دو کہ برتن سمیٹ لے اور دانش صاحب آجائیں تو مجھے بتا دینا۔" پھر اس نے ضمیر ہاشمی سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "میں ذرا ہاتھ دھو آؤں۔"

وہ واپس آئی تو ضمیر ہاشمی ایک کرسی پر ڈٹ چکا تھا۔ اُمید نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کہئے.......... کیسے زحمت کی آپ نے؟" اس کے نزدیک اس کی اچانک آمد کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی۔ بہرطور اس نے الماس ابدالی کے بھیجے ہوئے کاغذات لفافے میں رکھ دیئے۔

ضمیر ہاشمی اٹھا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ "میں نے سوچا تھا' شوفر کو بھیج کر تمہیں بلوا لوں گا لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اس نے اُمید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "گزشتہ منگل کے لنچ کے بعد امکان تھا کہ تمہیں اس

طرح کا بلاوا پسند نہیں آئے گا۔ تم میرے بلانے پر آ بھی سکتی تھیں مگر صرف اس لیے کہ تمہارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ تمہیں بہت برا لگتا.......... اور یہ میں نہیں چاہتا۔"

اُمید خاموشی سے اس کے مزید بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ اس کے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔ اس کی برہمی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔

"تم میری پوزیشن سے بخوبی واقف ہو اُمید۔" ضمیر ہاشمی نے کہا۔ "میرا اکاؤنٹ اس وقت تک تمہارا ہے جب تک مجھے کسی کاروباری معاملے میں تم سے کوئی شکایت نہیں ہوتی۔ میں اسے تلوار کی طرح تمہارے سر پر ہرگز نہیں لٹکاؤں گا۔"

اس کے لہجے میں حاکمیت اور بڑائی کا جو تاثر تھا' اس نے اُمید کو بھڑکا دیا۔ تاہم اس نے اپنا لہجہ نرم رکھا۔ "اور تمہارے خیال میں مجھے اس عنایت پر تمہارا شکرگزار ہونا چاہیے یہی بات ہے نا؟"

"ہاں' بالکل ہونا چاہیے۔" ضمیر ہاشمی نے آنکھیں سکیڑ لیں۔ "تم مانو یا نہ مانو۔ یہ حقیقت ہے کہ میں اپنے اکاؤنٹ کا دباؤ ڈال کر تمہیں مجبور کر سکتا ہوں۔"

"لیکن اس بات پر کسی سے شرط نہ لگا بیٹھنا کہ میں مجبور ہو بھی جاؤں گی۔" اُمید کا لہجہ سخت ہو گیا۔

ضمیر ہاشمی مسکرا دیا۔ "تمہیں یہ احساس ہونا چاہیے کہ اس قسم کے دباؤ کے سامنے تم ٹھہر نہیں سکو گی۔ انسان کو اپنی کمزوریوں کا علم ہونا چاہیے لیکن اُمید' میں یہ دباؤ استعمال نہیں کروں گا۔ اس طرح جو فتح مجھے حاصل ہو گی' وہ کھوکھلی اور بے لذت ہو گی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں دستبردار ہو رہا ہوں۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ تم جب بھی میری طرف بڑھو گی۔ اپنی مرضی سے بڑھو گی۔"

اُمید نے اس کی بات سنی اَن سنی کر دی اور جارحانہ انداز میں بولی۔ "تو اب تم ان کتوں کو واپس بلا رہے ہو جنہیں تم نے میرے پیچھے لگایا ہوا ہے؟"

"میں سمجھا نہیں۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"مجھے حیرت ہے' تم واقعی بار بار مجھے حیران کر دیتے ہو۔" اُمید نے طنز کیا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"میں اس شخص کی بات کر رہی ہوں جو پچھلے ہفتے سے مسلسل میرا تعاقب کر رہا ہے۔ پریمیئر والے دن سے۔" اب اُمید کے لیے اپنے غصے پر قابو پانا دشوار ہو رہا تھا۔

"میں نے کسی کو تمہارے تعاقب پر مامور نہیں کیا۔ مجھے ضرورت کیا ہے اس کی۔"

ضمیر ہاشمی کا انکار اور اس کے لہجے کی اُلجھن حقیقی معلوم ہو رہی تھی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا' یا تو تم بہت زبردست اداکار ہو یا تم.........."

"مجھے نہیں معلوم۔ اب مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ تمہارا تعاقب کون کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟"

اُمید ہچکچائی۔ وہ اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ "پریمیئر والے دن اُس شخص نے مجھے ایک پرچا دیا تھا۔ اُس میں مجھے وارننگ دی گئی تھی کہ میں.........." وہ سوچ میں پڑ گئی۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ "کہ میں امکان صدیقی سے دور رہوں۔ میں اس کے علاوہ کیا سوچتی کہ یہ سب کچھ تم ہی کر رہے ہو۔ مگر تم تو انکار کر رہے ہو۔"

"اور میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" ضمیر ہاشمی نے کہا۔ پھر تیز لہجے میں بولا۔ "تم امکان صدیقی سے ملتی رہی ہو؟"

"ہاں۔"

"تم اس کے متعلق سیریس ہو؟"

اُمید ایک لمحے خاموش رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ابھی ذہن میں شک اور بے یقینی کا ایک سایہ سا لہرائے گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ چنانچہ اُس نے پوری سچائی کے ساتھ جواب دیا۔ "بہت زیادہ۔" جواب دیتے ہی اُسے احساس ہوا کہ اس اعتراف کے ساتھ ہی جیسے اُس کا وجود خوشیوں سے لبالب بھر گیا ہے۔

ضمیر ہاشمی چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اُس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "خدا کی پناہ! مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ جذبۂ رقابت اب بھی مجھے جلا سکتا ہے۔" اُس نے کہا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں۔ وہ اُمید کو بغور دیکھ رہا تھا۔ "اب میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ مجھے حیرت کیوں ہوئی۔ تمہاری بات تو ہمیشہ مختلف رہی ہے۔ ممکن ہے' ابتدا میں مجھے محض تمہیں تسخیر کرنے کا جنون رہا ہو لیکن ایسا تھا تو وہ جنون بھی بہت پہلے مٹ چکا اور اس کی جگہ.........."

"دیکھیں، ضمیر صاحب.......... میں یہ سب کچھ سننا نہیں چاہتی ہوں۔"

ضمیر ہاشمی کو اس کی آنکھوں میں غصے کی چمک دکھائی دی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اُمید.......... میری زندگی میں عورتوں کی کبھی کمی نہیں رہی لیکن جس طرح تم نے مجھے متاثر کیا ہے.......... جتنا گہرا اثر تم مجھ پر ڈالتی ہو.......... جتنی شدید طلب تمہیں دیکھ کر میرے دل میں جاگتی ہے، وہ کسی اور.........."

"ہاشمی صاحب.........." اُمید کے لہجے میں تنبیہہ تھی۔ "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ مجھے دیکھ کر آپ کو کیا ہوتا ہے۔ یہ آپ کا مسئلہ ہے اور میں اس مسئلے کا حل ہرگز نہیں ہوں.......... نہ کبھی ہو سکتی ہوں۔"

ضمیر ہاشمی کھڑکی کے پاس سے ہٹا اور میز کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔ وہ اپنی قوت اور اختیار کا بھرپور احساس دلا رہا تھا۔ اُمید نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ خود اعتمادی کا جواب خود اعتمادی سے اور قوت کا جواب قوت سے دینا چاہتی تھی۔ ضمیر ہاشمی کی آنکھیں اس وقت اس کی قابضانہ فطرت کی پوری طرح غمازی کر رہی تھیں.......... کہہ رہی تھیں.......... تم میری ہو، کسی اور کی نہیں ہو سکتیں

"امکان صدیقی تمہارے ٹائپ کا نہیں ہے۔" ضمیر ہاشمی نے پُرغرور لہجے میں کہا۔ "وہ تمہارے لیے نہیں ہے۔"

اُمید خود کو اس کے سامنے کمتر محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ میں آپ سے بہتر جانتی ہوں.......... اور فیصلہ بھی میں ہی کروں گی۔"

"اس وقت تو خوابوں نے تمہاری آنکھیں چندھیا دی ہیں۔ ایسے میں کچھ نظر نہیں آتا لیکن خواب آنکھوں میں ہمیشہ نہیں رہتے۔ ایک وقت آئے گا کہ تم میرے پاس آنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔"

اُمید ایک لمحے کو تو اس کے لہجے کے یقین سے دہل گئی۔ پھر اس نے اس یقین سے لڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ "آپ ایک بات نظرانداز کر رہے ہیں۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "میری زندگی میں امکان شامل ہو یا نہ ہو، آپ کے بے ہُودہ سوال کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے اور رہے گا.......... نہیں، ہرگز نہیں۔"

ضمیر کے چہرے پر برہمی کا تاثر اُبھر آیا مگر اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔

اُمید کو بھی احساس تھا کہ غصے سے اس کے رخسار تمتما رہے ہیں لیکن وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے مسکراتے ہوئے دانش کا خیر مقدم کیا جو دستک کے بعد دروازہ کھول کر اندر آگیا تھا۔ وہ فرم کی لاہور برانچ کا سربراہ تھا۔

"مخل ہونے پر معذرت خواہ ہوں مس اُمید۔" اس نے کہا۔ اسی وقت اس کی نظر ضمیر ہاشمی پر پڑی اور وہ حیران نظر آنے لگا۔ "اوہ.......... ہاشمی صاحب! مجھے علم نہیں تھا کہ یہاں آپ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ کیسے ہیں آپ؟" اس نے ضمیر کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ تم سناؤ۔" ضمیر نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی.......... اللہ کا شکر ہے۔ آپ سنائیں.......... کوئی مسئلہ تو نہیں؟" دانش نے جملے کا آخری حصہ ادا کرتے ہوئے اُمید کی طرف دیکھا جیسے اس سے استفسار کر رہا ہو۔

"نہیں.......... کوئی مسئلہ نہیں۔" ضمیر ہاشمی نے جواب دیا۔

"تب تو ٹھیک ہے۔" دانش نے کہا اور مطمئن نظر آنے لگا۔

دانش اور ضمیر ہاشمی کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر ضمیر نے کہا۔

"ایکسیوزمی۔ میری ایک اور ملاقات طے ہے۔" یہ کہہ کر وہ اُمید کی طرف پلٹا۔ "اگلے ہفتے میں تمہیں لنچ پر مدعو کروں گا۔ میری سیکریٹری تم سے وقت طے کر لے گی۔ اوکے؟"

☆=========☆=========☆

اُس شام اُمید اپنے فلیٹ میں تنہا بیٹھی الماس ابدالی کے بھیجے ہوئے کاغذات کا جائزہ لے رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر اپنے برتھ سرٹیفکیٹ کی فوٹو کاپی پر پڑی۔ اپنا نام اسے خود بھی اجنبی سالگا.......... کرن ناصر ابدالی! وہ مسکرا دی۔ صرف پپّا ہی اسے اس نام سے پکارتے تھے۔ ان کے علاوہ ہر شخص کے نزدیک وہ اُمید تھی۔ خود اُمید کو اپنا نام کرن' بے حد فرسودہ اور گھسا پٹا معلوم ہوتا تھا۔

اب ایسا لگتا تھا' جیسے ابھی ایک ہستی اور موجود ہے جو اسے کرن کہہ کر پکار سکتی ہے.......... الماس ابدالی!

فون کی گھنٹی بجی۔ "بڑی بی کی عمر بڑی معلوم ہوتی ہے۔" اُمید بڑبڑائی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ "ہیلو؟"

"اُمید.......... میں امکان بول رہا ہوں۔"

اُمید کِھل اٹھی۔ "یہ تو غیر متوقع خوشی ہے میرے لیے۔"

"میرے لیے یہ اطلاع باعثِ مسرت ہے۔ میں ابھی ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے جا رہا تھا۔ سوچا' پہلے تمہیں فون کر کے معلوم کر لوں کہ اس ویک اینڈ پر کیا ارادے ہیں تمہارے؟ کوئی مصروفیت تو نہیں؟"

"ہاں' ہے تو سہی۔" اُمید نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ پھر جلدی سے بولی "تمہارے ساتھ۔ یہ بتاؤ' جمعرات کو یہاں آ رہے ہو تم؟"

"بس تھوڑی دیر کے لیے' تم تیار رہنا۔ میں تمہیں لینے آؤں گا۔"

"کہیں جانا ہے؟"

"ہاں۔"

"کہاں؟"

"یہ تو راز ہے۔"

"یہ زیادتی ہے۔" اُمید نے احتجاج کیا۔ "مجھے علم ہونا چاہیے تاکہ اسی اعتبار سے پیکنگ کر سکوں۔ اچھا.......... کوئی اشارہ تو دو۔"

"سامان لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس دو ایک جوڑے رکھ لینا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"بلکہ میں کہوں گا کہ اس کی بھی ضرورت نہیں۔ جمعرات کی شام چار بجے تیار رہنا۔"

"چار بجے تو میں آفس میں ہوں گی۔"

"جلدی چھٹی کر سکتی ہو۔ بس چار بجے.........."

"او کے!"

☆=========☆=========☆

اس فون کال کے چند گھنٹے بعد امکان صدیقی کو اطلاع ملی کہ الماس ابدالی کی نئی وارث کا نام معلوم ہو گیا ہے.......... کرن ناصر ابدالی..........'

☆=========☆=========☆

"تم بہت کِھلی کِھلی لگ رہی ہو۔" امکان نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"مجھے مایوسی ہوئی یہ سن کر۔" اُمید ہنس دی۔ "میں سمجھتی تھی کہ میں کِھلنے والی ہوں' خیر اب بتاؤ' پروگرام کیا ہے؟"

"لاؤ اپنا بیگ مجھے دو اور میرے ساتھ آ جاؤ۔"

وہ کار میں جا بیٹھے۔ "گویا بتاؤ گے نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اُمید نے پوچھا۔

"خود دیکھ لینا۔"

کار سپر ہائی وے پر رواں دواں تھی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ امکان کی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی۔ اُمید بیٹھی چپکے چپکے اسے دیکھ رہی تھی۔ ہائی وے کی چوکی سے گزرنے کے کوئی بیس منٹ بعد وہ بورڈ نظر آیا۔ اس پر لکھا تھا.......... "نخلستان۔ صحرا میں نخلستان کا لطف اٹھائیے۔" بورڈ کے ساتھ ہی ایک ذیلی سڑک تھی۔ دور دور تک بظاہر ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ امکان نے گاڑی ذیلی سڑک پر ڈال دی۔

کچھ دور جا کر درحقیقت نخلستان کے آثار نظر آئے۔ کھجور کے درختوں کے جھنڈ

نظر آئے۔ سڑک درختوں کے درمیان بل کھاتی' آگے بڑھ رہی تھی۔ اس پر سفر کرتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اور دنیا میں آگئے ہوں۔ ہائی وے کا تصور بھی ذہن سے مٹ گیا تھا۔

پھر کچھ فاصلے پر ایک بے حد خوبصورت عمارت نظر آئی۔ ایک جانب جھیل تھی۔ جھیل کے کنارے رنگ برنگے شیڈز کے نیچے میزیں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ قریب پہنچ کر پتا چلا کہ عمارت لکڑی کی ہے۔ جس نے بھی اسے ڈیزائن کیا تھا' بہت خوب صورت ڈیزائن کیا تھا۔

امکان نے عمارت کے سامنے پارکنگ ایریا میں کار پارک کر دی۔ وہ اور اُمید کار سے اتر آئے۔ اُمید متجسس نگاہوں سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی منظر اس قدر اچانک یکسر تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی نے جادو کے زور سے صحرا میں نخلستان بسا دیا ہے۔ وہ تو خواب سا معلوم ہو رہا تھا۔

"یہ........ یہ سب کیا ہے؟" اُمید نے خواب ناک لہجے میں پوچھا۔

"نخلستان ہے جو بڑی دشواریوں سے بنایا اور بسایا گیا ہے۔" امکان نے سادگی سے کہا۔

"یہ تم نے........ یہ تمہارا ہے؟"

امکان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں........ میں نے کہا تھا کہ میں نے بہت پہلے تفریح کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں تمہاری اس بات سے متفق ہوں کہ تعمیرات سے فطرت کا حسن متاثر ہوتا ہے۔ مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بیشتر لوگ فطرت کی خوبصورتی سے صرف اس صورت میں لطف اٹھا سکتے ہیں جب انہیں موجودہ دور کی تمام سہولیات میسر آئیں۔ میں نے لوگوں کو انتہائی خوب صورت مقامات پر نہایت بیزار دیکھا ہے صرف اس لیے کہ انہیں بیت الخلاء کی سہولت میسر نہیں تھی۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات' اور موجودہ دور میں زندگی کی رفتار اتنی تیز ہے اور مسائل اتنے زیادہ اور بدصورت ہیں کہ صرف حسنِ فطرت ہی انسان کو کچھ مہیا کر سکتا ہے۔ بدصورتی کا توڑ صرف خوبصورتی ہے۔ آدمی گرد و پیش کی........ زندگی کی بدصورتی سے اکتا کر زندگی پر یقین سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے میں فطری حسن ہی زندگی پر اس کا اعتماد بحال

کر سکتا ہے۔ میں لوگوں کو یہی اعتماد فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"بہت خوب! پہلی بار میری سمجھ میں تمہاری بات آئی ہے۔" اُمید نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھا۔ "اکثریت سہل پسند لوگوں کی ہے۔ زمین بہت بڑی ہے اور اللہ کا دیا ہوا حسن وافر ہے۔ ان میں سے ایک حصے کو تم سہل پسندوں کے لیے استعمال کرتے ہو۔ اس کے باوجود ہم جیسے فطرت پسندوں کے لیے بھی بہت کچھ بچ جاتا ہے۔ گویا نقصان میں کوئی نہیں ہے۔"

"ہاں' یہی بات ہے آؤ' اندر چلیں۔"

عمارت کے دروازے پر باوردی دربان نے امکان کو زور دار سیلوٹ کیا۔ اسے دیکھتے ہی مینیجر اپنے کمرے سے نکل آیا۔ امکان نے اوپری منزل کے دو کمرے اپنے لیے حاصل کیے ایک پورٹر اُمید کا بیگ اوپر لے گیا۔ امکان اور اُمید چائے کے لیے ڈائننگ ہال میں چلے آئے۔

چائے پیتے پیتے شام ڈھل چکی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ اوپر چلے گئے۔ امکان اُمید کو اس کا کمرا دکھا رہا تھا۔ اُمید نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ "یہاں ایک کمی ہے۔" پھر امکان کی سوالیہ نگاہوں کو محسوس کر کے اس نے وضاحت کی۔ "یہاں گلاب نہیں ہیں۔ اس کمرے کو گلابوں سے بھرا ہونا چاہیے تھا۔"

"ایک منٹ۔ میں ابھی آیا۔" امکان نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک جیول بکس تھا۔ اس نے جیول بکس اُمید کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو........ یہ تمہارے سوال کا جواب ہے۔"

اُمید چند لمحے اس خوبصورت جیول باکس کو حیرت سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "کیا مطلب؟"

"اسے کھول کر دیکھو۔"

اُمید نے باکس کھولا اور تصویرِ حیرت بن گئی۔ جیول باکس میں ایک نیکلس اور دو آویزے موجود تھے۔ سونے کی زنجیر کے ساتھ ایک سرخ گلاب پیوستہ تھا۔ دیکھنے میں وہ اصلی گلاب لگتا تھا۔ مگر درحقیقت وہ یاقوت کے پنکھڑی نما ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا۔ آویزوں میں نسبتاً چھوٹے گلاب تھے۔

"اب تمہارے پاس گلاب ہمیشہ رہیں گے۔" امکان نے کہا۔

اُمید عجیب سی نظروں سے زیورات کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ جس جذبے سے امکان نے اسے وہ تحفہ دیا تھا' وہ اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ بات صرف یہ نہیں تھی کہ امکان نے اسے ایک مہنگا تحفہ دینے کا ارادہ کیا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ کوئی بھی مہنگی چیز اٹھالاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس نے بہت غور و فکر کے بعد' بڑی محبت سے ایک ایسی چیز منتخب کی تھی جو ان کے تعلق کی اہمیت اور معنویت کو پوری طرح واضح کرتی تھی۔ وہ تحفہ درحقیقت ایک علامت تھا۔

امکان نے اس کی سُن انگلیوں کی گرفت سے جیولری باکس آزاد کرایا تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ امکان نے اس کے پیچھے جاکر نیکلس اسے پہنایا اور کھٹکا لگا دیا۔ پھر اس نے اُمید کے کندھے تھام کر اسے اپنے روبرو کیا۔ چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر اس نے بڑی نرمی سے اس کے کانوں میں پڑے ہوئے بُندے اتارے اور ان کی جگہ آویزے پہنا دیئے۔ چند لمحے جیسے وہ نتائج کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں اتنی محبت' اتنی طمانیت تھی کہ اُمید سُن ہو کر رہ گئی۔

"خوب صورت۔" امکان نے سرگوشی میں کہا۔ "تم نے ان کا حُسن دوبالا کردیا ہے۔"

"امکان.......... امکان........ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔"

اُمید کے لہجے میں حیرانی اور بے بسی تھی۔ اُسے وہ لفظ نہیں مل رہے تھے جو اس کی محبت اور شکرگزاری کا کسی حد تک بھی حق ادا کرسکتے۔

"کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

اور اُمید نے واقعی کچھ نہیں کہا۔ اس نے امکان کے دونوں ہاتھ تھامے اور انہیں اپنی بھیگی آنکھوں سے لگالیا۔ سینے میں جیسے کوئی سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

دونوں کچھ دیر یونہی کھڑے رہے۔ پھر امکان نے کہا۔ "آؤ جھیل کے کنارے ٹہلنے چلیں۔"

☆========☆========☆

صبح کے ناشتے پر وہ پھر یکجا ہوئے۔ اگرچہ رات وہ بہت دیر تک جھیل کے کنارے

چہل قدمی کرتے رہے تھے مگر صبح دونوں میں سے کوئی بھی دیر تک نہیں سوسکا۔

ناشتے کے بعد اُمید نے اپنا میک اپ باکس کھولا اور مناسب شیڈ کی لپ اسٹک تلاش کرنے لگی۔ بالآخر اس نے ایک شیڈ منتخب کیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا بیٹھی امکان اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر میک اپ باکس اٹھالیا۔

"بہت خوبصورت ہے۔" اُس نے تبصرہ کیا۔

"ہاں.......... اور مجھے بہت عزیز بھی ہے۔ یہ میرے لیے پپّا کا آخری تحفہ تھا۔ مجھے اٹھارویں سالگرہ پر دیا گیا تھا۔"

امکان نے باکس کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر اُسے کھول کر دیکھا۔ آئینے پر حروف کندہ تھے..........

"یہ میرے خاندانی نام کے حروف ہیں۔" اُمید نے کہا۔

امکان نے ان حروف کو دیکھا.......... کے۔ این۔ اے۔ اُسے ایسا لگا جیسے اُس کے اندر سب کچھ ساکت ہوگیا ہے.......... دل بھی جیسے دھڑکنا بھول گیا ہو۔ "کے.......... این.......... اے؟" اس نے دہرایا۔ اُس کی نظریں اُن حروف پر جم کر رہ گئی تھیں۔

"ہاں.......... تمہیں میرے خاندانی نام کا تو علم ہی نہیں۔ یہ نام میرے دادا نے رکھا تھا۔ پپّا ہمیشہ مجھے اسی نام سے پکارتے تھے.......... کرن ناصر ابدالی۔"

اس بار امکان اپنا ردِعمل نہ چھپا سکا۔ وہ سناٹے کی سی کیفیت میں اُسے دیکھتا رہا۔

"کیا بات ہے امکان؟ کیا ہوا تمہیں؟" اُمید نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔ امکان نے میک اپ باکس بند کردیا تھا اور اب اُسے اتنی سختی سے بھینچے ہوئے تھا کہ اُس کی انگلیوں کی پوریں سپید پڑگئی تھیں۔ اُمید کو ایسا لگا' جیسے امکان نے اس کی بات سنی ہی نہیں ہے۔ پھر امکان کی نظریں اُس کے چہرے کی طرف اُٹھیں۔ اُن میں سرد مہری تھی۔

"امکان.......... کیا ہوا.......... کیا بات ہے؟" اُمید نے دہرایا۔

امکان کی نظریں جھک گئیں۔ "بس یونہی.......... خیال آگیا تھا کہ میرے پاس میرے ماں باپ کی دی ہوئی کوئی چیز نہیں۔ ورنہ میں بھی اسے اتنا ہی عزیز رکھتا۔ اور کوئی بات نہیں۔" وہ چند لمحے باکس کو گھورتا رہا۔ اُمید اُٹھ کر اُس کے پاس آگئی۔ امکان نے میک اپ باکس اسے تھما دیا۔

اُمید کے لیے وہ میک اپ باکس ہمیشہ سے اہم رہا تھا۔ مگر اس وقت کسی انجانے ہاتھ نے اس کے دل کو مٹھی میں بھینچ لیا تھا.......... تو اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ درحقیقت وہ اس کے لیے قدر اہم ہے۔ اُسے اس لمحے اپنے پپا ٹوٹ کر یاد آئے۔

"امکان' میں.........." اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔

امکان نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں' کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا۔ اچانک ہی اس کا چہرہ بے تاثر ہو گیا۔ اس نے خود پر قابو پا لیا تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے اُمید کے بالوں کی ایک لٹ کو سہلایا۔ اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔

"کون ہے.......... آجاؤ۔" اس نے پکارا۔

"آپ کا فون ہے جناب۔" بٹلر نے کمرے میں جھانکا۔ "خرم صاحب نے فون کیا ہے جناب۔ وہ کہتے ہیں' کوئی بہت ضروری بات ہے۔"

"تم چلو' میں آ رہا ہوں۔ شکریہ"

☆=========☆=========☆

امکان کو غصہ بھی آ رہا تھا اور بے بسی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ قسمت نے اس کے ساتھ عجیب مذاق کیا تھا۔ مینجر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ انہی سوچوں میں آن جانی آگ پھنک رہا تھا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ کیا ضروری تھا کہ الماس کی نئی وارث اس کی اُمید ہوتی۔ اُمید ہی تو اس کی زندگی کا وہ واحد اثاثہ تھی جس پر اس نے اپنے بھیانک ماضی کی پرچھائیں بھی نہیں پڑنے دی تھی۔ وہ تو اس کے لیے دکھوں سے پاک حال اور خوشیوں سے لبریز مستقبل کی علامت تھی۔ پھر کیوں؟ کیوں؟ لعنت ہو۔ زندگی نے کبھی میرے ساتھ انصاف نہیں کیا.......... ہمیشہ ہی نا انصافی کی ہے! کبھی تو.......... کبھی تو..........

اس نے ریسیور اٹھایا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ "ہیلو خرم.......... کیا حال ہے؟" اس نے کوشش کی تھی کہ اس کی ذہنی کشیدگی کا اظہار اس کی آواز اور لہجے سے نہ ہونے پائے۔

"امکان.......... اس طرح ڈسٹرب کرنے پر معذرت لیکن بات ہی ایسی تھی کہ تمہارے علم میں فوری طور پر آنا چاہیے تھی۔ امکان.......... ہم نے کرن ابدالی کا سراغ پا لیا ہے۔ اُمید ظفر ہی درحقیقت کرن ناصر ابدالی ہے۔" دوسری طرف سے خرم نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" امکان کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

"تمہیں کب پتا چلا؟ کیسے پتا چلا؟"

"اب کیا فرق پڑتا ہے اس سے!" امکان نے کہا اور پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اس کا ذہن بے حد مصروف ہو گیا تھا۔

"اُمید کو معلوم ہے کہ تم کون ہو؟" خرم نے پوچھا۔ "کیا الماس ابدالی اس سے مل چکی ہے.......... اس سے بات کر چکی ہے؟"

"نہیں اُمید کو میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔" امکان نے جواب دیا اور ذہن میں ہر وہ بات دہرائی جو اس کے اور اُمید کے درمیان ہوئی تھی۔ اب تک اُمید کی کسی بات سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا جس سے ثابت ہوتا کہ وہ کسی طور بھی الماس سے متعلق ہے۔ وہ جانتا تھا کہ الماس اس سے کس قدر نفرت کرتی ہے۔ اسے موقع ملا ہوتا تو وہ اس کی طرف سے اُمید کو بدظن کرنے کی.......... اسے امکان کے لیے نفرت سونپنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اب تک اسے ایسا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس اعتبار سے یہ بات خوش آئند تھی۔ اب اسے کوشش کرنا تھی کہ الماس کو یہ موقع کبھی نہ ملے..........

"ممکن ہے' الماس کو تمہارا اور اُمید کے درمیان تعلقات کا علم ہی نہ ہو۔" خرم نے رائے زنی کی۔

"یہ عین ممکن ہے۔" امکان نے کہا۔ الماس اُمید سے مل چکی تھی لیکن یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ اُمید نے الماس کو اس کے متعلق.......... اس سے ملاقاتوں کے متعلق بتایا ہو گا۔ اس کی کوئی معقول وجہ بھی نظر نہیں آتی تھی۔ ویسے بھی یہ سب کچھ اتنے مختصر عرصے میں ہوا تھا۔ امکان تو یہی تھا کہ اُمید نے الماس سے نجی نوعیت کی گفتگو نہیں کی ہو گی۔ حالانکہ وہ بہت بولڈ لڑکی تھی۔

"امکان.......... اب تم کیا کرو گے؟ اُمید کو اب تک پتا نہیں چلا ہے تو چل جائے

گا۔"

"ممکن ہے' اسے کبھی علم نہ ہو۔ ممکن ہے' میں اُسے کبھی علم نہ ہونے دوں۔"

"کیسے؟"

اس 'کیسے' کا فی الوقت امکان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ ترکیب اُسے سوچنا تھی۔ "خرم......... اس سلسلے میں بعد میں بات ہوگی۔"

☆========☆========☆

وہ جھیل کے پاس کھڑا دُور اُفق پر نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے پلٹ کر اُسے دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں قربت کا احساس جگانے والا وہی تاثر تھا جو ہمیشہ اُمید کے دل کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتا تھا۔ اُمید مسکرا دی۔ ایسا لگتا تھا کہ طوفان' جس کی نوعیت کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا' گزر چکا ہے اور اب سب کچھ پہلے ہی جیسا ہے۔

"اُمید......... مجھے تم سے محبت ہے۔ کتنی؟ اس کا اندازہ تو میں بھی نہیں کرسکتا۔" اُس کے لہجے میں بڑی سچائی' بڑی شدت تھی۔ ان گھسے پٹے لفظوں میں گھٹیا پن کی رَمق نہیں تھی۔ حالانکہ وہ اُمید کو ہمیشہ گراں گزرتے تھے۔ مگر شاید کہنے والے کے جذبے کی سچائی نے انھیں دنیا کے خوب صورت ترین لفظ بنا دیا تھا۔

"مَیں بھی تم سے محبت کرتی ہوں امکان......... اپنی فہم اور احساس سے بھی سوا.........بہت زیادہ۔"

وہ اُس کے چہرے کو یوں تک رہا تھا جیسے اُس کے ایک ایک نقش کو حفظ کررہا ہو......... دل میں اُتار رہا ہو لیکن نہ جانے کیوں' اُمید کو اُس کے اس انداز میں کسی بہت گہری یاس کی جھلک نظر آئی۔ جیسے کوئی ڈوبنے والا تنکے کا سہارا تلاش کررہا ہو۔ وہ مایوسی اُس کی طرف سے تھی یا امکان کی اپنی تھی۔ یہ وہ نہیں بتا سکتی تھی۔ بہرحال......... وہ موجود تھی۔

"اُمید! ہمیں ملے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں؟"

اُمید نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔ "تین ہفتے۔"

امکان نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا اور اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "صرف تین ہفتے اور اب میں تصور بھی نہیں کرسکتا کہ تمھارے بغیر

میری زندگی ہوسکتی ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔ کیوں کہ میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں۔" اُمید نے بے ساختہ کہا اور خود بھی حیران رہ گئی۔ اظہار......... اس قسم کا اعتراف اس قدر آسان بھی ہوسکتا ہے۔ یہ تو اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو ایک چوٹ کھانے کے بعد اس جذبے کے سائے سے بھی بدکنے لگی تھی' اعتراف اور اظہار تو بہت دُور کی بات تھی۔ پھر یہ سب......... اتنی آسانی سے......... کیسے.........؟

"تمہیں یقین ہے کہ تم بھی میری طرح محسوس کرتی ہو؟"

اُمید نے خود کو بہت اچھی طرح ٹٹولا لیکن شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

"ہاں امکان۔" اُس نے سرگوشی میں کہا۔

"تو پھر مجھ سے شادی کرلو۔ آج......... اسی وقت........." اگر وہ بچنے کے لیے جواز تلاش کرتی تو پانچ منٹ میں درجن بھر دلیلیں میسر آجاتیں۔ ایک شادی غلطی ثابت ہوچکی تھی اور اب وہ اتنے عاجلانہ انداز میں وہ غلطی دہرانے والی تھی۔ ایک دلیل یہ بھی تھی کہ وہ تو امکان کو ٹھیک طرح سے جانتی بھی نہیں' انہیں ملے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ یہاں تو برسوں کی شناسائی بھی دھوکا دے جاتی ہے۔ اُسے اپنے کیریر کا خیال بھی نہیں آیا۔ یہ دلیلیں اُس کے ذہن میں آتیں بھی تو امکان کی محبت کے سامنے ہار جاتیں۔ وہ اُس سے محبت کرتی تھی......... اور اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ بھی اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کے بعد جواز اور دلیل کی گنجائش ہی کہاں رہتی ہے۔

"ہاں امکان' میں تم سے شادی کروں گی۔ جب تم کہو گے۔"

"تمہیں یقین ہے؟" امکان کے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔ "میں جانتا ہوں' دھوم دھام سے شادی کرنا۔ گیت گاتی سہیلیوں کے جھرمٹ میں حنا بند ہونا' سہاگ کا سُرخ جوڑا پہننا ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔ جب کہ میں........."

"نہیں امکان! میں یہ خواب بھی دیکھ چکی ہوں اور اس کی بھیانک تعبیر بھی۔" اُمید نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "میں سہاگ کا سُرخ جوڑا پہن کر شعلوں میں گھر چکی ہوں۔ مجھے اب ان چیزوں کی نہ کوئی پروا ہے' نہ آرزو۔ میرے لیے تمہاری محبت ہی بہت کافی ہے۔"

"اور میں تم سے بے اندازہ محبت کرتا ہوں۔" امکان کے لہجے میں اعتماد تھا۔ "وعدہ کرو، یہ بات ہمیشہ یاد رکھو گی۔"

"وعدہ کرتی ہوں.......... بشرطیکہ تم ہر لمحے مجھے یاد دلاتے رہو.......... ثابت کرتے رہو۔" اُمید نے شریر لہجے میں کہا۔

"میں سنجیدہ ہوں اُمید۔ گزرے ہوئے برسوں میں مَیں نے بہت دشمن بنائے ہیں۔ میرا کوئی دشمن کبھی تمہیں میرے متعلق کچھ بھی بتائے اور وہ کتنا ہی سچ یا حقیقت کے قریب معلوم ہو، تم صرف یہ بات یاد رکھنا کہ میں نے تمہیں خود سے زیادہ چاہا ہے اور یقین بھی رکھنا کہ مرتے دم تک تم سے ایسی ہی محبت کروں گا۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں زندگی بھر تمہیں بہت سنبھال کر رکھوں گی.......... زندگی کے سب سے قیمتی اثاثے کی طرح۔ میں تمہیں کبھی کہیں جانے نہیں دوں گی۔"

☆=========☆=========☆

"کیسے بیگ صاحب.......... کیا بات ہے؟" الماس ابدالی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ اسے کوئی بُری خبر سنانے والا ہے۔

"وہ دونوں کراچی واپس آگئے ہیں اور امکان کے بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" وکیل نے بتایا۔

"اوہ.......... تو یہ سچ ہے؟"

"جی ہاں۔ انہوں نے شادی کرلی ہے۔"

"اچھا۔ تب تو ہمیں اس سلسلے میں کچھ سوچنا پڑے گا۔ ہے نا؟" الماس ابدالی کی آواز میں خدشوں کی پھنکار تھی۔ لہجہ ایسا تھا، جیسے وہ وکیل سے اعتماد کی بھیک مانگ رہی ہو۔

"جی ہاں! کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔" وکیل کے پُراعتماد لہجے نے اُس کی توقع پوری کردی۔

چند منٹ بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔ الماس نے ریسیور رکھا اور صوفے پر ڈھے گئی۔ دھچکا بہت بڑا تھا۔ مگر وہ ہار بھی نہیں مان سکتی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کوئی صدیقی کسی ابدالی کو شکست دے دے نہیں.......... کامیابی کے اتنا قریب پہنچنے کے بعد تو اُسے آخری

دم تک لڑنا ہوگا.......... آخری دم تک!

☆=========☆=========☆

امکان اُمید کو اپنے دفاتر دکھا رہا تھا۔ "یہ صدیقی ٹاورز ہے.......... کمپنی کا ہیڈ کوارٹر۔" اُس نے کہا۔ وہ اس وقت گھر جا رہے تھے۔ "صبح تم میرے ساتھ دفتر چلنا۔ تمہیں خرم اور ماریہ سے ملوانا ہے۔"

"ضرور، مجھے بھی اشتیاق ہوگیا ہے اُن سے ملنے کا۔" اُمید نے کہا۔ امکان نے خرم اور ماریہ کے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں کی تھی۔ پھر بھی اُس نے اندازہ لگالیا تھا کہ امکان کی زندگی میں اپنے ان دو ساتھیوں کی بڑی اہمیت ہے اور وہ اُس کے لیے گھر کے فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "میری دُعا ہے کہ وہ مجھے ناپسند نہ کریں۔" اُس نے مزید کہا۔

"وہ تمہیں پسند کریں گے لیکن یہ بتادوں کہ ماریہ کا رویہ تمہارے لیے کسی ساس کا سا ہوگا۔"

"اوہ.......... اور اس سلسلے میں کوئی مشورہ؟"

"اُسے یہ بتاتی رہنا کہ تم مجھے کتنا اچھا.......... کتنا بڑا آدمی سمجھتی ہو۔ عظیم انسان۔ بس پھر وہ تمہارے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑے گی۔" امکان نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اُسے یقین تھا کہ ماریہ بھی اُمید سے اتنی محبت کرے گی جتنی وہ خود کرتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان کسی اختلاف کا امکان نہیں تھا۔

اُمید ہنس دی۔ "مجھے سچ بولتے ہوئے کبھی الجھن نہیں ہوتی۔ یہ تو بہت آسان کام ہے۔ اور ہاں.......... یہ تو بتاؤ میرے بغیر لقمہ تو تم بھی نہیں توڑتے۔"

"اصل اہمیت اسی بات کی ہے کہ تم کیا سمجھتی ہو۔"

اُمید کو احساس ہوا کہ امکان کا موڈ اچانک ہی تبدیل ہوگیا۔ اب وہ کچھ سنجیدہ بھی تھا اور اس کے انداز سے پہلے سے زیادہ قربت کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ "اچھا.......... اب مجھے خرم کے بارے میں بھی بتاؤ۔ اُسے تسخیر کرنے کی کیا صورت ہوگی؟"

"اُسے کاروں کا خبط ہے۔ اس سے صرف کاروں کے متعلق گفتگو کرو۔ کاروں سے متعلق اُس کی معلومات کو سراہو۔ اُس کا کاروں کے سلسلے میں وہی رویہ ہے جو میرا تمہارے ساتھ ہے۔" امکان نے اُسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

☆==========☆==========☆

کم از کم اب تم اُن سے پابندیِ وقت کی توقع نہیں کر سکتے۔" ماریہ نے خرم کو تسلی دی۔ "دیکھو نا.......... پرسوں ہی تو اُن کی شادی ہوئی ہے۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ میں اُمید سے ملنے کو بُری طرح بے تاب ہو رہی ہوں۔"

خرم نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ اس بات سے متفق نہیں ہو سکتا تھا۔ اُس کے اعصاب کشیدہ ہو رہے تھے۔ "میں یہ بات نہیں کہہ سکتا۔"

ماریہ نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ "کیوں؟ کیوں نہیں کہہ سکتے؟"

"اس لیے کہ.........." خرم کہتے کہتے رُک گیا۔ اب تک اُس نے ماریہ کو حقیقت نہیں بتائی تھی، لیکن کب تک۔ کبھی تو حقیقت کھلنی ہی تھی۔ "اس شادی کے بارے میں میرے کچھ خدشات ہیں۔" بالآخر اس نے کہا۔ پھر جھنجلا کر بولا۔ "حد ہو گئی، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ امکان نے یہ حماقت کیوں کی پہلے مجھ سے تو بات کر لیتا۔"

"وہ اُس سے محبت کرتا ہے۔" ماریہ نے کہا۔ اُس کے نزدیک یہی ایک بات بہت کافی تھی۔

"تم میری بات نہیں سمجھیں۔ میں فکر مند اسی لیے ہوں کہ وہ اُمید سے محبت کرتا ہے۔ اس محبت ہی کی وجہ سے وہ زندگی میں پہلی بار صورتِ حال کا درست تجزیہ کرنے سے قاصر رہا ہے۔"

ماریہ نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ تنقید سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ "امکان بچہ نہیں ہے۔ اپنا بُرا بھلا بخوبی سمجھتا ہے۔"

خرم نے جھنجلا کر حقیقت اگل دی۔ پھر کہا۔ "اب بولو۔ اُمید کو الماس اور خواب نگر کے بارے میں پتا چلے گا تو کیا ہوگا۔ رات میں نے اُس سے فون پر بات کی تو معلوم ہے، اُس نے کیا کہا؟ کہنے لگا.......... میں یہ بات اُمید کو کبھی نہیں بتاؤں گا۔"

خرم کی توقع کے برعکس ماریہ نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ "بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔" اُس نے بے حد سکون سے کہا۔

"جلد یا بدیر، اُمید کو پتا چلنا ہی ہے۔ اُس سے چھپانے کا کیا فائدہ؟ بات کھلے گی تو وہ اس رازداری کا نہ جانے کیا مطلب لے گی۔"

☆==========☆==========☆

خرم اور ماریہ اُمید سے مل کر بہت متاثر ہوئے۔ اُس کی شخصیت دل موہ لینے والی ثابت ہوئی۔ دوسری طرف اُمید کو چند منٹ میں ہی اندازہ ہو گیا کہ ماریہ بھی امکان کو اُس سے کم نہیں چاہتی۔ کہنے کو وہ اُس کا باس تھا۔ مگر اُس کا تذکرہ کرتے وقت اُس کی آنکھوں میں جو چمک نظر آتی، وہ قابلِ دید ہوتی۔ امکان کی کامیابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اُس کے لہجے میں بے پناہ فخر ہوتا۔ اُمید کے لیے یہ بات باعثِ طمانیت تھی کہ ماریہ حاسد ثابت نہیں ہوئی۔ بس وہ اُسے امکان کو خوش رکھنے کی تلقین کرتی رہی۔ اُمید نے امکان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا ڈالے۔ ماریہ کی باچھیں کھل گئیں۔

چائے کے بعد خرم امکان کو باہر لے گیا۔ "میرے دفتر میں چلو۔" اُس نے کہا۔

"تمہیں پریشانی کیا ہے خرم؟"

"پریشانی یہ ہے کہ تم تو پشاور جا رہے ہو۔ اتنے دن اُمید یہاں تنہا رہے گی۔ ظاہر ہے، اس کا استعفا منظور ہونے میں اور اسے اپنی میز صاف کرنے میں کچھ دن تو لگیں گے ہی۔ اگر اِس دوران الماس خانم اُس سے مل بیٹھی تو کیا ہوگا؟ بہتر یہی ہے کہ تم اُسے حقیقت بتا دو۔"

"میں یہ سب کچھ سوچ چکا ہوں۔" امکان نے گہری سانس لے کر کہا۔ "میں چاہتا ہوں، تم نصیر کو الرٹ کر دو۔ اُمید کو ایک منٹ کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے۔ فون اٹینڈ کرنے کے لیے بھی کسی کو مامور کرو۔ الماس یا مرزا شمشاد بیگ میں سے کوئی اُمید سے بات نہ کرنے پائے، جمعہ کو میں واپس آجاؤں گا۔ ویسے میں کوشش کروں گا کہ اُمید کو اس سے پہلے ہی پشاور آجانے پر رضامند کر لوں۔"

"لیکن امکان! اس سے کیا ہوگا۔ تم چوبیس گھنٹے تو اُمید کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

"دیکھو.......... پشاور میں اُمید کسی کو نہیں جانتی۔ وہ اسی سے ملے گی نا، جس سے میں اُسے ملواؤں گا۔ اُس پر نظر رکھنا اتنا مشکل بھی نہیں ہوگا۔"

"تم تو یہ ثابت کر رہے ہو کہ یہ سب بہت آسان ہے کوئی سنگین مسئلہ نہیں۔" خرم کے لہجے میں برہمی در آئی۔ "حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ.........."

"میں جانتا ہوں۔" امکان نے اُس کی بات کاٹ دی۔ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ

اُس کی وجہ سے خرم جیسا ٹھنڈے دماغ کا آدمی بھی برا فروختہ ہوگیا۔ "یہ تو مجھے اب پتا چلا ہے کہ میں بہت لالچی آدمی ہوں۔ مجھے خواب نگر بھی چاہیے.......... اور میں اُمید سے دستبردار بھی نہیں ہو سکتا۔ میں ان دونوں کے حصول کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔"

"میرا خیال ہے نہیں.........." امکان نے تلخ لہجے میں کہا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔ "میں دیکھتا ہوں۔" خرم نے کہا اور ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔

"ہیلو.......... خرم اسپیکنگ۔" اُس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ دوسری طرف سے چند لمحے بات سننے کے بعد اُس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے' امکان سے کہا۔ "الماس خانم کی خادمہ رضیہ بات کر رہی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے ریسیور امکان کے طرف بڑھا دیا۔

"کہو رضیہ' کیا بات ہے؟".......... امکان نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ پھر وہ سنتا رہا۔ اُس کا جسم کشیدہ ہو رہا تھا۔ بالآخر اُس نے کہا۔ "اطلاع دینے کا شکریہ رضیہ۔" اور ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ پھر اُس نے خرم کو بتایا۔ "وہ کہہ رہی تھی کہ الماس خانم کی حالت بہت خراب ہے۔ شاید وہ بچ نہیں سکے گی۔"

خرم نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ خواہش کرتے ہوئے میں خود کو مُجرم محسوس کر رہا ہوں.......... مگر کاش' یہ سچ ہو۔"

"میں یہ خواہش کرتے ہوئے خود کو مُجرم محسوس نہیں کرتا۔" امکان نے کہا۔

"ویسے مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ معاملہ بہت تیزی سے کلائمکس کی طرف بڑھ رہا ہے اور امکان' مجھے خدشہ ہے کہ صورتِ حال بہت زیادہ نازک ثابت ہوگی۔ تمھارے لیے الجھنیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔"

"میں جانتا ہوں۔"

☆=========☆=========☆

خلافِ توقع اُمید امکان کے ساتھ ہی پشاور چلی آئی تھی۔ مگر اُسے دو دن بعد کراچی واپس آنا تھا۔ وہ دن امکان کی قربت میں کسی خوب صورت خواب کی طرح بہت تیزی

سے بیت گئے تھے۔ پھر امکان کسی کام کے سلسلے میں لاہور چلا گیا۔ اُسے گئے ہوئے چند گھنٹے ہو چکے تھے۔ ایک گھنٹے بعد اُمید کو کراچی کی فلائٹ پکڑنا تھی۔

دھوپ کی کرنیں اس کی انگوٹھی میں جڑے ہوئے ہیرے پر پڑیں تو اس میں سے رنگ برنگی شعاعیں نکلتی محسوس ہوئیں۔ اُمید نے انگوٹھی کو بڑے پیار سے دیکھا اور زیرِلب خود کو پکارا.......... "اُمید صدیقی!" اور اسے یہ امتزاج .... اپنے نام کی یہ تبدیلی بہت بھلی لگی۔

وہ میٹرو ایڈورٹائزنگ سے استعفا دے رہی تھی۔ مگر اس کا کیریر ترک کرنے کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ پشاور ہی میں کوئی ایڈورٹائزنگ ایجنسی جوائن کر لے گی۔ وہ امکان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ پھر اسے ایک خیال اور بھی سُوجھا تھا۔ وہ امکان کے پروجیکٹس کی پبلسٹی کی پلاننگ بھی کر سکتی تھی۔ اس طرح بے کار ہونے کا احساس بھی نہیں ہو گا اور وہ پابند بھی نہیں ہو گی۔ بلکہ وہ امکان کا ہاتھ بٹا رہی ہو گی۔

امکان کے بارے میں سوچتے سوچتے اسے امکان سے اپنی گفتگو یاد آگئی۔ رخصت ہونے سے کچھ دیر پہلے گفتگو کے دوران امکان نے اچانک ہی کہا تھا.......... "اُمید.......... ہمارے ناموں میں کیسی عجیب معنویت ہے۔ ثابت ہوتا ہے کہ تمہارے بغیر میں عدم ہوں.........."

"وہ کیسے؟"

"اُمید نہیں ہو گی تو امکان کیسا؟"

"میرا نکتۂ نظر مختلف ہے۔ امکان نظر نہیں آئے گا تو اُمید کی نمو ہی نہیں ہو گی۔"

امکان ہنس دیا تھا۔ "چلو.......... تب تو بات اور پکی ہو گئی میں تمہارا سبب ہوں اور تم میرا۔ میں تم سے ہوں اور تم مجھ سے۔ اب یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔"

خرم نے بریک لگائے تو وہ چونکی۔ کار ائیرپورٹ پہنچ چکی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ شادی کے ابتدائی ایام میں بھی امکان کی مصروفیات نے تمہیں تنہا کر دیا ہے۔" خرم نے کہا۔ اس کے لہجے میں حقیقی تاسف تھا۔ "تم دونوں کو تو بہت طویل ہنی مون منانا چاہیے تھا۔"

اُمید اس کے لہجے کی سچائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ "مجھے کوئی ملال نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے ہی سے علم تھا کہ امکان کو بزنس کے سلسلے میں بے حد متحرک رہنا پڑتا ہے۔"

دونوں ٹرمینل کی طرف چل دیئے۔ اس وقت ایک پولیس مین نے خرم کو ٹوک دیا۔

"جناب......... آپ یہاں کار پارک نہیں کرسکتے۔ آئی ایم سوری........."

خرم نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مگر پارکنگ کے لیے کوئی اور مناسب جگہ نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ پریشان ہوگیا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔" اُمید نے اسے تسلی دی۔

خرم ہچکچایا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اس نے دونوں سوٹ کیس اُمید کی طرف بڑھا دیئے۔ اُمید نے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک سوٹ کیس تھاما اور ٹرمینل بلڈنگ میں داخل ہوگئی۔ وہ ڈیپارچر گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی کہ کسی نے کھرکھراتی آواز میں پکارا۔ "ایک منٹ محترمہ! میں معافی چاہتا ہوں۔"

اُمید نے بے دھیانی سے اس شخص کو دیکھا۔

"آپ کرن ابدالی ہیں نا؟" اس شخص نے پوچھا۔ "خانم الماس نے آپ کا حلیہ بالکل درست بیان کیا تھا۔ مجھے آپ کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔"

"خانم الماس؟" پہلے تو اُمید کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا' پھر اسے الماس ابدالی یاد آگئی۔ "کمال ہے! میں نے سوچا تھا' واپس آتے ہی انہیں فون کروں گی۔ آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"

وہ شخص مسکرایا۔ "میرا نام روشن خان ہے۔ میں خواب نگر کا منتظم ہوں۔"

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں........." اسی وقت پبلک ایڈریس سسٹم پر اعلان ہوا کہ کراچی جانے والی فلائٹ روانہ ہونے والی ہے۔ مسافروں کو طلب کیا جا رہا تھا۔ "معاف کیجئے گا' مجھے اس فلائٹ سے جانا ہے۔" اُمید نے کہا۔

"آپ نہیں جاسکتیں محترمہ! آپ کا خانم الماس سے ملنا بہت ضروری ہے۔"

"لیکن........."

"محترمہ! خانم الماس بسترِ مرگ پر ہیں۔" روشن خان نے زور دے کر کہا۔ "وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"کیا......... کیا کہہ رہے ہیں آپ!"

"جی ہاں محترمہ! یہ سچ ہے۔ کاش' ایسا نہ ہوتا لیکن خواہشیں اس طرح کے معاملات میں پوری کہاں ہوتی ہیں۔"

"میں......... میں........."

"وہ دماغ کے ٹیومر میں مبتلا ہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں چھ ماہ پہلے ہی جواب دے دیا تھا۔" روشن خان نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "وہ بار بار آپ کو پکار رہی ہیں۔" اس کی نم آنکھوں میں خاموش التجا مچلنے لگی۔ "آپ میرے ساتھ چلی چلئے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح آپ کو ڈھونڈ کر لے آؤں گا' جلدی چلئے......... خدا نہ کرے......... مگر کہیں' ہمیں پہنچنے میں دیر نہ ہو جائے۔"

اُمید بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ جانا ضروری تھا مگر بسترِ مرگ پر دراز کسی عزیزہ کی آخری پکار کو نظرانداز کر کے جانا آسان نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے معاملات زندگی بھر کے لیے ضمیر کا بوجھ بن جاتے ہیں۔ "ٹھیک ہے۔ میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

☆==========☆==========☆

روشن خان نے ایک طرف ہٹ کر اُمید کو راستہ دیا۔ وہ بیڈ روم میں داخل ہوئی اور بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ گھنے سفید بالوں کا بادل اب بھی ویسا ہی تھا مگر چہرہ جھریوں سے بھر گیا تھا۔ الماس ابدالی بہت زیادہ بوڑھی نظر آرہی تھی۔ اگرچہ اُمید اس سے صرف ایک بار ملی تھی۔ پھر بھی فرق اتنا واضح تھا کہ وہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔

اُمید کا گلا رندھنے لگا۔ وہ اپنی کیفیت چھپانے کے لیے مسکرائی۔ "خانم الماس' دیکھیے......... یہ میں ہوں......... کرن ابدالی۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

الماس ابدالی کی پلکیں لرزیں' سیاہ آنکھیں کھلیں۔ وہ اپنی نگاہ کو ٹھہرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "کرن........." اس کے ابرو کھنچ سے گئے۔ "کہاں ہو تم؟ میرے قریب

آکر بیٹھو۔ میں تمہیں دیکھ نہیں پا رہی ہوں۔"

اُمید کرسی سے اٹھی اور بیڈ کی پٹی پر بیٹھ کر بوڑھی الماس پر جھک گئی۔ بوڑھی آنکھوں میں اچانک چمک سی لہرائی اور طمانیت در آئی۔ "تم نے یہ حماقت کیوں کی؟" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "شادی کرنے کے لیے امکان صدیقی ہی رہ گیا تھا۔ تم نے اس کے باطن میں کیوں نہیں جھانکا؟"

"کیا؟ آپ امکان کو جانتی ہیں؟" اُمید کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے کرن ابدالی۔" سیاہ آنکھیں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ "تم طلاق لے سکتی ہو' شمشاد بیگ دعویٰ دائر کر دے گا۔"

"طلاق! کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟" اُمید نے بے بسی سے روشن خان کو دیکھا۔ "خانم الماس کی کیفیت ہذیانی ہے۔" اس نے روشن خان سے کہا۔

"آپ ان کی باتیں غور سے سنیں۔" روشن خان نے التجا کی۔

"وہ تمہیں استعمال کر رہا ہے کرن۔" الماس کو اب بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ "اس نے تم سے صرف اس لیے شادی کی ہے کہ تمہارے ذریعے اسے خواب نگر مل سکتا ہے۔"

"کیسی ناقابلِ یقین بات ہے۔ آپ عجیب بات کر رہی ہیں۔" اُمید اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت اس کے جسم کا رواں رواں الماس کے بیان کی تردید کر رہا تھا۔

"میری بات مانو' میں سچ کہہ رہی ہوں۔" بڑی بی کے لہجے میں اصرار تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ چہرے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شدید اذیت سے دوچار ہے' وہ صرف قوتِ ارادی کے زور پر باتیں کر رہی تھی۔ "یہ سچ ہے وہ سمجھتا تھا کہ میں خواب نگر اس کے نام چھوڑنے پر مجبور ہوں اور اگر تم نہ مل گئی ہوتیں تو ہوتا بھی یہی۔" اس نے آنکھیں موند لیں۔ "اب یہ مجھے معلوم نہیں کہ میری تمام تر رازداری کے باوجود وہ تم تک کیسے پہنچ گیا۔ بہرحال......... خواب نگر اسے نہیں ملنا چاہیے کرن! تمہیں اسے روکنا ہو گا۔ خواب نگر پر اس کا کوئی حق نہیں۔" اب اس کی آواز ڈوب رہی تھی۔ "میں نے اپنے دادا کی موت کے وقت اس سے وعدہ کیا تھا کہ خواب نگر کی زمین پر کبھی کسی صدیقی کو قدم بھی نہیں رکھنے دوں گی۔ تمہیں میرے وعدے کی لاج رکھنا ہو گی سن رہی

ہو نا؟"

"جی ہاں......... سُن رہی ہوں۔" اُمید نے کہا۔ اسے یقین ہو گیا کہ خانم الماس پاگل ہو گئی ہے جو کچھ وہ کہہ رہی تھی۔ اس کا اس کے علاوہ کوئی جواز نہیں تھا۔ امکان اس سے محبت کرتا تھا اور وہ امکان سے۔ یہ بنیاد تھی ان کی شادی کی۔ خواب نگر کہاں سے بیچ میں آ گیا؟

"اس پر......... کبھی اعتبار نہ کرنا۔ ایسے لوگ اپنے مقصد کے حصول کے لیے......... کچھ بھی کر سکتے ہیں......... قتل بھی۔ شمشاد بیگ اور گلزار تمہیں سب کچھ بتا دیں گے ان کے پاس ہر چیز کا ثبوت بھی موجود ہے۔"

"ہم یہاں موجود ہیں......... بیگ صاحب اور میں۔" گلزار نے جلدی سے کہا۔ "ہم کرن صاحبہ کو سب کچھ بتا دیں گے۔"

"گلزار......... مجھے بہت تکلیف ہو رہی ہے۔" الماس ابدالی نے سسکتے ہوئے کہا۔ "اب میں مزید بات نہیں کر سکتی۔"

"اب آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں بیگم صاحبہ۔" گلزار نے کہا۔ پھر وہ شمشاد بیگ سے بولا۔ "کرن صاحبہ کو نیچے لائبریری میں لے جائیے' اور ہاں......... ڈاکٹر کو بھیج دیجئے گا۔"

"آیئے۔" شمشاد بیگ نے اُمید سے کہا۔ اُمید کی کیفیت اس وقت بہت عجیب تھی۔ وہ دُکھی بھی ہو رہی تھی اور الجھن اور بے یقینی کا شکار بھی تھی۔ تاہم وہ وکیل شمشاد بیگ کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل آئی۔

"یہ خانم الماس امکان کے بارے میں کیسی فضول باتیں کر رہی تھیں۔" سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے وکیل سے کہا۔

شمشاد بیگ ایک لمحے کو ہچکچایا۔ "وہ فضول باتیں نہیں تھیں کرن صاحبہ۔"

"آپ بھی........." وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس گھر میں موجود ہر شخص کی رائے امکان کے بارے میں اچھی نہیں ہے۔ بات سمجھ نہیں آتی تھی۔ آخر امکان یہ کیسے سوچ سکتا تھا کہ خواب نگر ورثے میں اسے ملے گا۔ بلکہ ممکن ہے' اس نے خواب نگر کا کبھی نام بھی نہ سنا ہو۔ یقینی طور پر الماس ابدالی ہذیان میں مبتلا تھی۔ اس نے

یہ بات وکیل سے کہہ بھی دی۔ ”خانم الماس نے خود مجھے بتایا تھا کہ خواب نگر کسی رشتے دار ہی کو مل سکتا ہے۔“ اس نے مزید کہا۔

”اور آپ کے شوہر خانم الماس کے بھانجے ہیں۔“ اُمید کے لیے یہ انکشاف دھماکے سے کم نہیں تھا۔

”یہ.......... یہ کیسے ممکن ہے۔“ اس نے کہا۔ ”امکان نے بتایا تھا کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں..........“

”امکان خانم الماس کی چھوٹی بہن کا بیٹا ہے.......... اس بہن کا جسے خانم نے ماں بن کر پالا تھا۔“ شمشاد بیگ نے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں چمک نظر آئی۔ ”اور یہ بھی طے ہے کہ امکان نے آپ کو یہ بات نہیں بتائی ہو گی۔“

”نہیں۔“ اُمید نے نفی میں سرہلا دیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر یہ سچ ہے تو امکان نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ کیا اس نے جان بُوجھ کر الماس ابدالی کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ حالانکہ اس میں اس کی بدنیتی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ ممکن ہے، امکان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو۔

”اور میرا خیال ہے، انھوں نے اور بھی بہت سی باتیں آپ سے چھپائی ہوں گی۔“ شمشاد بیگ نے کہا۔

”یہ تو آپ کہہ رہے ہیں۔“ اُمید نے تند لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کی ہر بات پر یقین نہیں کرتی۔ مجھے اس قسم کی خرافات پر یقین کرنا بھی نہیں چاہیے۔ آپ مجھے وہ ثبوت دکھائیں جن کے بارے میں خانم الماس نے کہا تھا۔ لائیے.......... کہاں ہیں وہ ثبوت؟“

اسی وقت گلزار بھی واپس آ گیا۔ شمشاد بیگ نے اس سے کہا۔ ”امکان نے انہیں نہیں بتایا کہ خانم الماس ان کی خالہ ہیں۔“

”یہ سچ ہے محترمہ۔“ گلزار نے اُمید سے کہا۔ ”وہ اسی مکان میں پیدا ہوئے تھے، خانم الماس کے کمرے کے برابر والے کمرے میں۔ وہ ایک سوگوار دن تھا ہمارے لیے۔“

”لیکن امکان کے والد..........“

”نعمان صاحب کاہل اور ناکارہ آدمی تھے۔“ گلزار نے مُنہ بنا کر کہا۔ ”انھوں نے

کبھی نیلم بی بی کی پرواہ نہیں کی۔ انھوں نے تو بس دولت اور آسائش کے لالچ میں نیلم بی بی سے شادی کی تھی۔ خانم بی بی نعمان کی محبت میں دیوانی ہو رہی تھیں۔ انھیں دنیا میں نعمان کے سوا کوئی بھی.......... کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ صدیقی خاندان کے مرد ہوتے ہی اتنے وجیہہ ہیں اور لڑکیوں کو لبھانے کا فن بھی جانتے ہیں۔ نیلم بی بی بھی مجبور تھیں۔ انھوں نے خانم الماس کی ایک نہ سُنی اور نعمان کے لیے گھر بھی چھوڑ دیا۔ خانم کچھ بھی نہ کر سکیں، وہ نیلم بی بی سے بہت محبت کرتی تھیں۔ مگر انھوں نے اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا اور نیلم بی بی سے قطع تعلق کرلیا۔ وہ خانم کے لیے بے حد اذیت ناک دن تھے۔ نیلم بی بی کو انھوں نے ہی ماں بن کر پالا تھا۔“

”تو قطع تعلق کے باوجود امکان کی پیدائش یہاں کیسے ہوئی؟“ اُمید نے اعتراض کیا۔

”نیلم بی بی بہت بیمار تھیں اور نعمان اُن کا علاج بھی نہیں کرا سکتا تھا۔ خانم نے نیلم بی بی کی محبّت کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھیں یہاں بلا لیا۔ نعمان بھی اُن کی کمزوری سے واقف تھا اسی لیے اُس نے نیلم بی بی پر ظلم ڈھائے تھے۔ میں نے خانم کو سمجھایا تھا کہ وہ نرمی سے کام لے کر اپنے اور خواب نگر کے لیے بلا مول لے رہی ہیں۔ مگر خانم نے کہا کہ نعمان سامنے رہے گا تو وہ اس کے عزائم سے باخبر رہیں گی۔ حالانکہ نعمان کے عزائم کا علم سبھی کو تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ خانم الماس، نیلم بی بی سے عمر میں بہت بڑی ہیں۔ جلدی چل بسیں گی اور بالآخر نیلم بی بی کے توسط سے خواب نگر کی جاگیر اسے مل جائے گی لیکن اُس کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ نیلم بی بی خون کے سرطان میں مبتلا ہو گئیں۔ اس طرف سے مایوس ہو کر نعمان نے شراب نوشی شروع کر دی۔ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اُس کے تمام خواب بکھر گئے تھے۔“

”خواب نگر کی کہانی بہت طویل اور الجھی ہوئی ہے۔“ اس بار شمشاد بیگ نے لب کشائی کی۔ ”ابدالی اور صدیقی خاندانوں کی دشمنی بہت پرانی ہے۔ روایات کے مطابق اس کا سبب یہ تھا کہ صدیقی خاندان کے کسی مرد نے کسی شادی شدہ ابدالی خاتون کو ورغلایا تھا۔“

”خانم الماس بے حد روایت پرست خاتون ہیں۔ انھیں اور ہم سب کو صدیقی خاندان کے ہر فرد سے نفرت ہے لیکن نیلم بی بی نے اُنھیں عذاب میں مبتلا کر دیا۔“ گلزار

نے کہا۔ ”محبت کسی سے بھی ہو، محبت کرنے والا بڑے دکھ اٹھاتا ہے۔“

”تو بات یہ ہے۔“ اُمید نے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔ ”امکان نے مجھ سے شادی کی ہے لہٰذا آپ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ وہ خواب نگر کے چکر میں ہے۔“

”یہ بات ہم صرف اس لیے نہیں سوچ رہے ہیں کہ انہوں نے آپ سے شادی کر لی ہے۔“ شمشاد بیگ نے کہا۔ پھر وہ چند لمحے ہچکچانے کے بعد بولا۔ ”کچھ اور اسباب بھی ہیں اس سوچ کے، یہ بتائیں، آپ انہیں کب سے جانتی ہیں؟“

”ہمیں ملے ایک ماہ ہوا ہو گا۔“ اُمید نے جواب دیا۔ اسے خود بھی احساس ہو رہا تھا کہ کسی کو سمجھنے اور جاننے کے لیے یہ عرصہ بے حد ناکافی ہے۔

”کیسا عجیب اتفاق ہے۔“ وکیل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ بھی تقریباً ایک ماہ پہلے کی بات ہے کہ ہم نے طویل جستجو کے بعد آپ کا سراغ لگایا تھا اور اس کے فوراً بعد ہی خانم الماس نے امکان کو مطلع کیا تھا کہ انہیں خواب نگر کے لیے ایک وارث مل گیا ہے۔ اب وہ خواب نگر کا خیال دل سے نکال دے۔“

”تو کیا انہوں نے امکان کو میرا نام بھی بتا دیا تھا؟“

”نہیں، لیکن امکان جیسے اثر و رسوخ والے شخص کے لیے یہ معلوم کرنا مشکل نہیں تھا۔“

اُمید اس حقیقت کی تردید نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ”آپ یہ بات بھول رہے ہیں کہ امکان بے حد دولت مند ہے، وہ خواب نگر جیسی سو جاگیریں بھی بہ آسانی خرید سکتا ہے۔ پھر اسے کیا پڑی کہ خواب نگر کے حصول کے لیے شادی جیسی نعمت کو ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کرے۔“ اس نے اعتراض کیا۔

”اس میں کوئی شک نہیں لیکن یہ وہ سوال ہے جو آپ کو امکان ہی سے پوچھنا ہو گا۔ وہی اس کا جواب دے سکتے ہیں۔ وہی یہ بتائیں گے کہ انہیں خواب نگر کے گرد و پیش کی زمینیں خریدنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب کہ ان زمینوں کی کوئی کاروباری اہمیت بھی نہیں۔ اُمید صاحبہ! یہ بات مان لیں کہ وہ خواب نگر ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“

اُمید تردید کرنا چاہتی تھی...... بحث کرنا چاہتی تھی لیکن شمشاد بیگ کا لہجہ بے حد پُراعتماد تھا۔ چنانچہ وہ محتاط ہو گئی۔ ”آپ ہی یہ بھی بتا دیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”آپ تو ان کے آفس بھی گئی تھیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے منصوبے آپ کو نہیں دکھائے؟“

”کیسے منصوبے؟“ اُمید کے لہجے میں برہمی تھی۔

”وہ دریا کا رُخ بدل کر اس وادی کو جھیل میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ یہاں کاٹیج اور ہوٹل وغیرہ تعمیر کریں گے۔ بہت مہنگی تفریح گاہ بنانے کا منصوبہ ہے ان کا، اور منصوبہ واقعی شاندار اور متاثر کن ہے۔“

”میں یقین نہیں کر سکتی۔“ اُمید نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”امکان کے خلاف آپ کے تمام الزامات کی بنیاد صرف ایک بھولی بسری حقیقت پر ہے کہ اس کے والد نے شادی کے ذریعے خواب نگر پر قابض ہونے کی کوشش کی تھی۔ اگر میں مان بھی لوں کہ امکان خواب نگر پر قابض ہونا چاہتا ہے تو بھی وہ یہ مقصد کسی بھی ذریعے سے پورا کر سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے شادی یہ سوچ کر ہرگز نہیں کی۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم امکانات کا جائزہ لیتے...... ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔“ شمشاد بیگ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ”مثلاً وہ آپ سے یہ جاگیر خریدنے کی کوشش کر سکتے ہیں کیوں کہ آپ ہی خواب نگر کی وراث ہیں لیکن ان کے نکتۂ نظر سے یہ بات یقینی تو نہیں ہے کہ آپ خواب نگر کو بیچنے پر رضامند ہو جائیں گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہیں آپ کو مجبور کرنے کے لیے خواب نگر کے حوالے سے معاشی دباؤ ڈالنا پڑے گا۔ یا پھر انہیں اپنا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کرنا ہو گا۔ تیسری صورت یہ ہو گی کہ وہ وصیت نامے کو قانونی طور پر چیلنج کریں، بہرکیف، وہ ان میں سے کوئی راستہ بھی اختیار کریں، اس میں کئی برس لگ جائیں گے اور کامیابی کی کوئی ضمانت نہیں ہو گی۔ اس کے برعکس آپ سے شادی کی صورت میں کامیابی یقینی بھی ہے اور زیادہ وقت بھی نہیں لگے گا۔“

”یعنی آپ کے خیال میں یہ ممکن نہیں کہ اسے واقعتاً مجھ سے محبت ہو۔“ اُمید کے لہجے میں تلخی بھی تھی اور چیلنج بھی۔

”معاف کیجئے گا، میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ خدانخواستہ آپ پُرکشش نہیں...... محبت کے لائق نہیں۔ البتہ اس بات نے امکان کے کام کو بہت آسان بنا دیا ہو گا۔“

اُمید کو یہ سننا بُرا تو لگا مگر بات تو خود اس نے ہی چھیڑی تھی۔ "مجھے آپ کی کسی بات پر یقین نہیں۔" اس نے کشیدہ لہجے میں کہا۔

"یقین کریں محترمہ' آپ کے شوہر خواب نگر کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا بس چلا تو یہ گھر' یہ زمین سیکڑوں فٹ پانی کے نیچے ہو گی۔ صرف آپ ہی انہیں ایسا کرنے سے روک سکتی ہیں۔"

لائبریری کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اُمید نے دروازے کی طرف دیکھا۔ گلزار کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ پریشانی سے سپید پڑ گیا تھا۔ چند لمحے بعد کھلے ہوئے دروازے پر ڈاکٹر نمودار ہوا۔ اس نے باری باری ان تینوں کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "وہ ہر تکلیف سے آزاد ہو گئیں۔ آخری لمحات میں بھی وہ بے حد پُرسکون تھیں۔"

اسی لمحے اُمید کو اندازہ ہو گیا کہ اب اس کے لیے زندگی کا اہم ترین کام خواب نگر کو بچانا ہے...... ہر قیمت پر!

☆=========☆=========☆

امکان نے ماریہ کو دیکھا۔ خلافِ معمول ماریہ کے لبوں پر اس کے لیے خیر مقدمی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر دکھ اور پریشانی کا گہرا تاثر تھا۔ امکان نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "کچھ پتا چلا اس کا؟" ماریہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "میں اپنے دفتر میں ہوں۔ خرم سے کہو کہ فوری طور پر مجھ سے مل لے۔" امکان نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

اپنے دفتر میں پہنچ کر وہ کرسی پر ڈھے گیا۔ غم و غصے سے اس کا برا حال تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔ اگلے ہی لمحے خرم اور ماریہ دفتر میں داخل ہوئے۔ امکان کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ دروازے میں اُمید کھڑی تھی۔ وہ پتھر کے کسی مجسمے کی طرح ساکت تھی۔

اُمید کا وجود کسی انجانی آگ میں پھنک رہا تھا۔ امکان کو ایک نظر دیکھتے ہی رہے سہے شکوک ڈھل گئے۔ اس نے ماریہ اور خرم کو نظرانداز کر دیا اور اپنی پوری توجہ اس شخص پر مرکوز کر دی' جس نے اسے کسی کھلونے کی طرح استعمال کیا تھا' جس نے اسے دھوکا دیا تھا۔

امکان اُمید کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ مگر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے کا برہمی کا تاثر اطمینان میں ڈھل گیا۔ "تم کہاں تھیں اُمید؟ ہم تمہارے لیے پریشان ہو رہے تھے۔"

"یقیناً ہو رہے ہو گے۔" اُمید نے سرد لہجے میں کہا۔ پھر وہ نپے تلے قدموں سے آہستہ آہستہ اس کی میز کی طرف بڑھی۔ "تمہیں کس بات کا خدشہ تھا؟ تم مجھے کیا معلوم نہیں ہونے دینا چاہتے تھے؟ یہی نا کہ الماس ابدالی تمہاری خالہ تھی؟ یا یہ کہ مجھ سے پہلے تم خواب نگر کے اُمیدوار تھے؟ یا یہ کہ خانم الماس نے مجھے ڈھونڈ نکالا تو تمہیں خواب نگر کے حصول کی سب سے آسان صورت یہ نظر آئی کہ مجھ سے شادی کر لو۔"

امکان کو فوراً ہی صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا۔

"اُمید...... میں جانتا ہوں کہ بہ ظاہر یہ سب کچھ اسی طرح نظر آئے گا لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔"

"کیا واقعی؟" اُمید نے لرزیدہ آواز میں طنز کیا۔ اب...... امکان کے سامنے وہ خود پر قابو رکھنے سے قاصر تھی۔ "ویسے تم مجھے بے وقوف سمجھے ہو گے۔ میں نے کتنی آسانی سے تمہارے ہر جھوٹ کو قبول کر لیا تھا۔ میں سچ مچ یہی سمجھ بیٹھی تھی کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ میں نے تمہیں اعتبار کے قابل سمجھا تھا۔ تمہارے لیے مجھ پر قابو پانا کتنا آسان ثابت ہوا تھا۔ بس...... تم نے اپنی کشش کا سوئچ آن کیا اور میرے قدم اکھاڑ دیئے ہے نا؟"

"اُمید...... تم غلطی پر ہو۔ زیادتی کر رہی ہو تم؟"

"نہیں امکان...... غلطی تم سے سرزد ہوئی ہے۔" اُمید نے کہا۔ وہ یہ سوچ کر آئی تھی کہ امکان اس کے تمام شکوک رفع کر دے گا اور ہوا بھی یہی تھا۔ امکان نے اس کے تمام شکوک رفع کر دیئے تھے۔ مگر اس کی توقع کے برعکس۔ اس نے اپنی برات کے تمام شکوک رفع کر دیئے تھے۔ اُمید نے ایک جھٹکے سے اپنی انگلی سے شادی کی انگوٹھی اتاری اور امکان کے سامنے پھینک دی۔ "اب تمہاری طرح میرے لیے یہ انگوٹھی بھی بے معنی اور غیر اہم ہے۔" اس نے کہا۔ امکان کی آنکھوں میں اذیت دیکھ کر اسے مسرت کا احساس ہونے لگا۔ وہ واپس جانے کے لیے پلٹنے لگی لیکن کچھ سوچ کر رک گئی۔

"ہاں......... تمہیں یہ اطلاع بھی دے دوں کہ آج دوپہر بارہ بج کر بیالیس منٹ پر تمہاری خالہ کا انتقال ہو گیا۔ اب میں خواب نگر کی مالک ہوں اور خدا کی قسم' میں خواب نگر کی زمین کا ایک انچ بھی تمہارے قبضے میں نہیں جانے دوں گی۔"

اس بار وہ واپس جانے کے لیے مڑی تو امکان نے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ اس کی گرفت بہت سخت تھی۔ اس کی انگلیاں اُمید کے بازو میں گڑی جا رہی تھیں۔

"اُمید......... یہ کیا بکواس ہے۔ کیا تم میری بات نہیں سنو گی؟" اس کا لہجہ بھی سخت تھا۔

اُمید نہ تو سہمی اور نہ ہی اس نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ "کیا بات ہے امکان؟ شاید تمہاری سمجھ میں آگیا ہے کہ اب تمہاری کشش کام نہیں دکھا سکے گی۔ اب تمہیں تشدد پر مجبور ہونا پڑے گا۔ خانم الماس نے کہا تھا کہ تم خواب نگر کے حصول کی خاطر کچھ بھی کر سکتے ہو۔"

امکان نے تیزی سے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اس کے جبڑے بھنچ گئے تھے۔ آنکھوں میں بے مہری اتر آئی تھی۔ اس نے اُمید کو روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اُمید دروازے پر پہنچ کر رکی اور اس نے امکان کو پلٹ کر دیکھا۔ "ابھی ایک گھنٹے بعد تدفین ہو گی لیکن تم نہ آنا۔ میں تمہیں خانم الماس کو کندھا دینے کی اجازت نہیں دوں گی۔"

امکان خالی دروازے کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اُمید کی اتاری ہوئی انگوٹھی اٹھائی اور کھلی ہتھیلی پر رکھ لی۔ ہیرے کی چمک اسے اپنا مضحکہ اُڑاتی محسوس ہوئی۔ اُمید نے بھی تو اس کا مضحکہ اڑایا تھا۔ چند لمحے انگوٹھی کو دیکھنے کے بعد اس نے سختی سے مٹھی بھینچ لی اور میز کے عقب میں اپنی کرسی کی طرف بڑھ گیا۔

"تم اسے روکتے کیوں نہیں؟" خرم نے بدمزگی سے کہا۔ "اسے سمجھانے کی کوشش کرو اس طرح تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔"

"اس وقت وہ کچھ سننے اور سمجھنے کے موڈ میں نہیں ہے۔" امکان نے کہا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ اس نے اُمید کو اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اس کے لیے اپنے دل کا ہر دروازہ بند کر چکی ہے۔

"امکان ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ماریہ نے جلدی سے کہا۔ "اس وقت وہ خود کو چوٹ کھایا ہوا محسوس کر رہی ہے اور جواب میں بھی صرف زخم ہی لگا سکتی ہے۔ جب آدمی کا

دل دکھا ہوا ہو تو معقولیت اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ فی الوقت کچھ نہیں ہو سکتا البتہ دو چار دن میں اس کی ذہنی کیفیت بہتر ہو گی تو اسے کچھ سمجھایا جا سکے گا۔"

"کاش' ایسا ہی ہو۔" خرم نے کہا۔ مگر اس کے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔

"مجھے یقین ہے۔" ماریہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ امکان کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "امکان......... وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ مجھے اس بات پر اس طرح یقین ہے' جیسے کل سورج کے طلوع ہونے اور صبح ہونے پر........."

"اگر ایسا نہ ہوا تو.........؟" خرم نفی میں سر ہلاتے ہوئے بڑبڑایا۔

"ماریہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔" امکان نے مٹھی کھولی اور اُمید کی اتاری ہوئی انگوٹھی پر نظر جما دی۔ "میں یہ انگوٹھی اسے دوبارہ پہنا کے رہوں گا۔ ممکن ہے' اس میں کچھ عرصہ لگے......... لیکن ایسا ہو گا ضرور میں نہ اُمید کو گنواؤں گا اور نہ خواب نگر سے محروم رہوں گا۔"

لیکن خرم مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے مضطربانہ انداز میں بالوں میں انگلیاں لہراتے ہوئے کہا۔ "سارا قصور میرا ہے۔"

☆=========☆=========☆

آنے والے وقت نے خرم کے خدشوں کو درست ثابت کر دیا۔ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ امکان نے اُمید کے زخمِ اعتبار کی گہرائی کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ اس کے غصے کی شدت کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا تھا۔ آئندہ چند مہینے کثرت سے ضمیر ہاشمی کے ساتھ دیکھی جا رہی تھی۔ اب ضمیر اُمید کا بزنس پارٹنر بھی تھا۔ اُمید نے صرف خواب نگر کو بچانے کے لیے اپنی کمپنی قائم کر لی تھی۔ ضمیر ہاشمی اس کمپنی میں اُس کا پارٹنر تھا۔

☆=========☆=========☆

ضمیر ہاشمی جہاز سے اُترا تو اُمید کو اپنا منتظر پایا۔ بارش شدید ہو رہی تھی۔ اُمید نے چھتری اُس کی طرف بڑھا دی۔ "میری کار موجود ہے۔ جلدی سے چلو۔ اپنا سامان واپسی میں لے لینا۔" اُمید نے کہا۔

"واپسی میں! مگر جانا کہاں ہے ہمیں؟"

"اب سے دس منٹ پہلے شمشاد بیگ اور عالم خان سے ہماری ملاقات طے تھی۔

تمہاری فلائیٹ لیٹ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ وہ ہمارے منتظر ہوں گے۔" اُمید اسے تقریباً کھینچتی ہوئی دروازے کی طرف چلی۔ باہر نکل کر وہ اُمید کی کار کی طرف بڑھ گئے۔ "عالم خان کی اسٹیٹ ایجنسی ہے۔ وہ کوشش کر رہا ہے کہ خواب نگر سے ملحق بیدار بخت کی زمینیں ہمیں مل جائیں۔" اُمید نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "بیدار بخت کی وہ آبائی زمین ہے......... اور وہ اسے بیچنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ عالم خان مُصر تھا کہ ہم سے براہِ راست بات چیت بہت ضروری ہے۔ میں کئی مرتبہ اس سے مل چکی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ آج تم بھی اس سے مل لو........."

☆=========☆=========☆

میٹنگ میں شمشاد بیگ اور ضمیر ہاشمی کی حیثیت خاموش تماشائیوں کی سی تھی۔ اُمید میٹنگ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے انداز میں شدت، جارحیت اور استقلال تھا۔ ضمیر ہاشمی اسے دیکھ کر حیران تھا۔ اس نرم و نازک لڑکی کا یہ روپ اس کے لیے نیا تھا۔

"تم نے ابھی خود کہا تھا کہ بیدار بخت اپنی زمین فروخت کرنے پر تیار ہو سکتا ہے۔" اُمید نے عالم خان سے کہا۔

"جی ہاں، اور میں نے غلط بھی نہیں کہا تھا۔ مگر بیدار بخت کی بیٹی زرینہ اس سودے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔"

"باپ کے ہوتے ہوئے زمینوں پر بیٹی کا کیا حق ہو سکتا ہے!" اُمید کا لہجہ تند ہو گیا۔

"زمین بیدار بخت کے نام ہے۔ اسے بیٹی سے اجازت لینے کی مطلق ضرورت نہیں۔"

"ضرورت ہے۔ سب کچھ زرینہ ہی کے اختیار میں ہے۔"

"کیسی عجیب بات کر رہے ہو۔ آخر وہ اس کی بیٹی ہے۔" اُمید کی آواز بلند ہو گئی۔

"دیکھیے......... صورتِ حال کے قانونی پہلو کے بارے میں تو میں آپ کو بہتر طور پر نہیں سمجھا سکتا۔ یہ کام بیگ صاحب کریں گے۔ بات کچھ یوں ہے کہ زرینہ بیدار بخت کی قانونی طور پر......... کیا کہنا چاہیے......... سرپرست ہے۔ گزشتہ سال بیدار بخت آپریشن کے لیے اسپتال میں داخل ہوا تھا تو اس وقت اس نے سب کچھ زرینہ کو سونپ دیا تھا۔ بیدار بخت کی اپنی حالت ایسی ہے کہ اس سے ٹھیک طور سے بولا بھی نہیں جاتا۔ بیدار بخت کی بیوی کو تو شوہر کی تیمارداری سے فرصت نہیں ملتی ویسے بھی یہ معاملات اس

کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ وہ تو صرف اتنا جانتی ہے کہ اسپتال کا خطیر رقم کا بل ادا کرنا ہے اور دیگر قرضے بھی ہیں۔"

"تو کیا اس لڑکی کا دماغ خراب ہے۔" اُمید نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔ "کیا یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ہماری پیش کش قبول کرنے کی صورت میں اس کے والدین کو تحفظ اور سکون کا احساس ملے گا۔ وہ ادائیگیوں کی فکر سے بے نیاز ہو کے اپنے آخری ایام سکون سے بسر کر سکیں گے۔ اس احمق لڑکی کو یہ فکر ہے کہ مرنے کے بعد اس کا باپ دفن کہاں ہو گا۔ حالانکہ اسے یہ سوچنا چاہئے کہ اس کے باپ کو نئی زندگی مل جائے گی۔"

"یہ تو آپ کہہ رہی ہیں نا۔" اسٹیٹ ایجنٹ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ تو بس ہر قیمت پر اپنی زمینیں فروخت ہونے سے بچانا چاہتی ہے۔"

"تو وہ جو اسے سرپرست کی حیثیت حاصل ہے......... جو اس کے پاس حقِ ملکیت ہے، اسے کسی طرح فسخ نہیں کرایا جا سکتا؟" اُمید نے شمشاد بیگ سے پوچھا۔

"کرایا جا سکتا ہے۔" وکیل نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کہا۔ "لیکن اس کے لیے ہمیں عدالت میں زرینہ کی نااہلی ثابت کرنا ہو گی۔ اس میں خدا جانے کتنا وقت لگے۔ اور اس دوران بیدار بخت کا انتقال ہو گیا تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"اور اگر ہم اس سے پہلے ہی زمین کی فروخت کے کاغذات پر اُس کے دستخط کرالیں تو کیا اس معاہدے پر عمل درآمد ہو سکے گا؟" اُمید نے پوچھا۔

"بہ ظاہر اس کا کوئی امکان نہیں۔" شمشاد بیگ نے جواب دیا۔

"بیگم صاحبہ، آپ کو یہ حقیقت تسلیم کر لینا چاہیے کہ وہ لوگ زمین نہیں بیچیں گے۔" عالم خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر آپ اس سلسلے میں مزید پیش رفت کرنا چاہتی ہیں تو آپ کسی اور ایجنٹ سے بات کریں۔ پچھلی بار جب مَیں گیا تو زرینہ نے مُجھ پر بندوق تان لی تھی۔ وہ تو دیوانی ہے۔ اس سلسلے میں اُس سے کچھ بھی بعید نہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ اگلی بار وہ گولی ہی چلا دے۔ کمیشن کی رقم کتنی ہی خطیر کیوں نہ ہو، اُس کے لیے مَیں اپنی زندگی تو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ مجھے افسوس ہے کہ مَیں آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"میں سمجھتی ہوں۔" اُمید نے کہا لیکن اس کی نظریں اُسے بزدلی کا طعنہ دیتی

محسوس ہو رہی تھیں۔

عالم خان نے اپنا بریف کیس بند کیا اور بولا۔ ”نیک خواہشات کے ساتھ۔“

”شکریہ!“ اُمید نے کہا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اب عالم خان کو جاتے دیکھ رہی تھی۔

شمشاد بیگ نے اپنا سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور نظریں اُٹھا کر اُمید کو دیکھا۔

”اِس صورت حال کا ایک امید افزا پہلو بھی ہے۔“ اُس نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ ”زرینہ اگر وہ زمین آپ کو نہیں بیچ رہی تو کسی اور کو بھی نہیں دے گی۔“

”میرے لیے صرف اتنا کافی نہیں۔“ اُمید نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مجھے وہ زمین ہر قیمت پر چاہیے ہمارے ترقیاتی منصوبے کی تکمیل کے لیے اس زمین کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور خواب نگر کی بقا کے لیے وہ ترقیاتی منصوبہ ناگزیر ہے۔ اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم زمین کے رہن شدہ کاغذات مُنہ مانگی قیمت دے کر خریدیں۔ اس کے بعد ہم انھیں بالجبر اس زمین سے بے دخل کر سکتے ہیں۔“

”کیوں؟“ ضمیر ہاشمی نے کہا۔ اُس نے ناقدانہ نظروں سے اُمید کا جائزہ لیا۔ اُمید کی آنکھوں میں اب وحشیانہ غصّے کی چمک تھی۔

”یہ کس قسم کا سوال ہے؟“ اُمید نے تند لہجے میں پوچھا۔ ”تم جانتے ہو کہ اس زمین کی کیا اہمیت ہے۔“

”میرا خیال ہے‘ مَیں نہیں جانتا۔“ ضمیر ہاشمی نے کہا۔ اپنی طویل کاروباری زندگی میں اس کا واسطہ بارہا اس قسم کے جملوں سے پڑا تھا‘ جو اَب اُمید ادا کر رہی تھی لیکن اسے اُمید کے منہ سے یہ سب کچھ سننا بہت برا لگ رہا تھا۔ ”وہ اپنی زمین پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو یہ اُن کا حق ہے اور تم انھیں بے دخل کرنے کی بات کر رہی ہو۔“ اُس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔

”میں اتنی سفاک نہیں ہوں۔“ اُمید نے نہایت برہمی سے کہا۔ ”لیکن میں رہن کے کاغذات خرید کر انھیں مجبور کرنا چاہتی ہوں کہ وہ اس زمین کو فرخت کر دیں۔ میں اُنھیں قلاش کر کے بے دخل نہیں کرنا چاہتی۔ ہم انھیں وہ قیمت دیں گے جو اصل قیمت سے زیادہ ہوگی۔“

”اور تمھارے لیے صرف یہ ایک بات کافی ہے‘ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تم سفاکی کا مظاہرہ نہیں کر رہی ہو؟“ ضمیر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”بات کیا ہے اگر تمھارے ذہن میں کوئی متبادل صورت ہے تو مجھے بتاؤ۔ اگر نہیں تو ہمارے پاس دستبردار ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ گویا امکان..........“

”میں سوچ رہا تھا کہ امکان صدیقی کا تذکرہ آخر کب چھڑے گا۔“ ضمیر بڑبڑایا۔

”تمھارے خیال میں‘ ہماری جنگ کس سے ہے؟“ اُمید جھنجھلا گئی۔ ”خواب نگر پر تسلط کے لیے کون لڑ رہا ہے اور اگر صورتِ حال یہی رہی تو امکان جیت بھی جائے گا۔“

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم امکان سے زیادہ بے رحم اور سفّاک ہو گئی ہو۔“

”مجھے ایسا بننا پڑے گا۔“ اُمید نے چیخ کر کہا۔ ”وہ مجھے تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”اور صرف اس وجہ سے تمھیں یہ حق مل گیا ہے کہ بیدار بخت اور اس کے گھرانے کو تباہ و برباد کر دو؟“

”میں ایسا.......... ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ ہم انھیں تباہ و برباد نہیں کر رہے ہیں۔ ہم تو اُن مدد کر رہے ہیں۔“ اُمید نے دلیل دی۔

”وہ مدد چاہیں یہ نہ چاہیں‘ تمھیں اس سے غرض نہیں۔ تم تو ان پر اپنی امداد تھوپنا چاہتی ہو۔“

”تم اتنے حق کے علمبردار کب سے ہو گئے؟“ اُمید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم جو اب تک اپنے کئی حریفوں کو دوالیا کر چکے ہو‘ اب تک اپنے ہتھکنڈوں سے نہ جانے کتنی کمپنیوں پر قابض ہو چکے ہو۔ ذرا اپنے گریبان میں بھی جھانک لو..........“

”وہ کاروبار تھا اُمید ڈیئر! مگر جو کچھ تم کہہ رہی ہو‘ وہ انتقام ہے۔“ ضمیر نے بے حد تحمّل سے کہا۔ ”یہ بات میری سمجھ میں ذرا دیر سے آئی کہ تم صرف اتنا چاہتی ہو کہ امکان سے اپنا ذاتی حساب برابر کر لو‘ ممکن ہے‘ یہ بات میں پہلے سے جانتا ہوں لیکن سمجھنے سے گریز کرتا رہا ہوں۔“

”یہ درست نہیں ہے۔“ اُمید نے تردید کی۔ اس الزام پر وہ بے حد چینی محسوس کرنے لگی۔

"مجھے یہ کہتے ہوئے دُکھ ہو رہا ہے کہ میں نے جو کچھ کہا درست ہے۔" ضمیر نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "تم نے مجھے استعمال کیا۔ تم میری طرف صرف اس لیے بڑھیں کہ میں امکان کے مقابلے میں تمہارا ساتھ دے سکتا تھا۔ تم نے میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو امکان نے تمہارے ساتھ کیا۔ تم نے مجھے اسی طرح استعمال کیا ہے جس طرح امکان نے تمہیں استعمال کیا تھا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" اُمید کا غصہ اب آخری حدوں کو پہنچ رہا تھا۔

"یہ سچ ہے.......... اور اب مجھے پتا چلا ہے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں۔" ضمیر نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اپنے محسوسات پر خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اس وقت اس کے دل میں اُمید کے لیے صرف ایک ہی جذبہ تھا۔ اسے اُمید پر ترس آرہا تھا۔ "تم شوق سے رہن کے کاغذات خریدو.......... بیدار بخت اور زرینہ کو زمین سے زبردستی بے دخل کرو.......... جو جی چاہتے کرو، مجھے کوئی غرض نہیں۔ تم بالکل بدل چکی ہو۔ تم منتقم مزاج بن گئی ہو۔ انتقام کی خواہش نے تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ میں اب تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"تم کہاں جارہے ہو؟" اُمید نے پکارا۔

ضمیر نے پلٹ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔ "واپس جارہا ہوں.......... کراچی۔ یقین کرو۔ اس وقت میں اپنی بیوی کے پاس پہنچنے کو تڑپ رہا ہوں۔"

اُمید کا جسم کشیدہ ہوگیا۔ "تو تم میرا ساتھ چھوڑ رہے ہو؟ میرا خیال تھا ہم پارٹنر ہیں۔"

ضمیرہاشمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھرکنے لگی۔ "ایک بار تم نے کہا تھا کہ میرے اور تمہارے درمیان صرف کاروباری تعلق ہے۔ اب میں تم سے یہی بات کہہ رہا ہوں۔ آئندہ کبھی مجھ سے ملنا ہو تو پہلے میری سیکریٹری کو فون کرکے وقت لے لینا۔"

اُمید نے جھٹکے سے منہ پھیرلیا۔ ضمیر کا الزام اُس کی سماعت میں گونج رہا تھا۔ پھر اُسے احساس ہوا کہ شمشاد بیگ اُسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ "میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی وہ درست نہیں سمجھ رہا ہے۔" وہ مدافعانہ لہجے میں بولی۔ اُسے افسوس ہورہا تھا کہ اُس نے ضمیر کو ان فون کالز کے بارے میں نہیں بتایا جو مسلسل موصول ہو

رہی تھیں اُسے دھمکیاں دی جارہی تھیں لیکن اب دیر ہوچکی تھی۔ ضمیر جاچکا تھا۔ اب اُسے کچھ بتانا بے سود تھا۔

"جی ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" شمشاد بیگ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

اُمید نے کاغذات سمیٹ کر اپنے بیگ میں رکھے اور دروازے کی طرف چل دی۔ "تم سُن چکے ہو کہ ہمیں کیا کرنا ہے، اب دیر نہ لگاؤ۔ رہن کے کاغذات خرید و جتنی جلدی ممکن ہو۔" اس نے پلٹ کر شمشاد بیگ سے کہا۔ پھر وہ دروازے سے گزر گئی۔ ضمیرہاشمی کے الفاظ کی چبھن اُسے اب بھی محسوس ہورہی تھی۔

باہر نکل اُس نے رین کوٹ کے کالر اُٹھالیے۔ اُس نے چھتری کھولنے کی زحمت نہیں کی بلکہ دوڑتی ہوئی اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ بارش اب بھی بہت تیز ہورہی تھی۔ اُس نے وائپر چلادیئے۔ پھر اُس نے کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔

وہ کم رفتار سے ڈرائیو کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد اُسے احساس ہوا کہ ایک دوسری کار اُس کی کار کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہوتی، بشرطیکہ موسم نارمل ہوتا۔ بارش کی وجہ سے ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اُمید نہ جانے کیوں بے چینی محسوس کرنے لگی۔

پھر اچانک تعاقب کرنے والی گاڑی نے فُل ہیڈلائٹس ماریں۔ اُمید کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اندھیری طوفانی رات میں وہ روشنی ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ زیرلب بڑبڑائی۔ پھر اُس نے کئی بار لائٹس جلا بجھا کر اشارہ دیا۔ پھر اُس نے عقب نما آئینے میں پچھلی کار والے کو ہاتھ سے بھی اشارہ کیا کہ وہ لائٹس ہلکی کردے لیکن پچھلی کار والے نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

تیز روشنی سے بچنے کے لیے اُمید نے اپنی گاڑی سائیڈ میں کی تاکہ پچھلی کار آگے نکل جائے لیکن پچھلی کار بھی سائڈ پر ہوگئی۔ شاید وہ اس کا پیچھا چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اُمید کو اچانک ہی خطرے کا احساس ہوا۔ میٹنگ کے بعد کی برہمی اور غصہ دب گیا۔ وہ چوکنا ہوگئی۔ تین چار دن پہلے ایک گاڑی نے اسی طرح تعاقب کے بعد اُسے سائیڈ مار کر سڑک سے نیچے اُتارنے کی کوشش کی تھی۔ شاید یہ وہی ڈرائیور تھا۔ اُس نے پہلے بھی چھپ کر وار نہیں کیا تھا بلکہ پہلے خاصی دیر تک اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا

تھا۔ شاید وہ اُسے خوف زدہ کرنا چاہتا تھا۔ اس بار بھی.........

اُمید کے اعصاب چٹخنے لگے۔ اس نے کھڑکی سے سر باہر نکالا اور چلّائی۔

"اے......... تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" پھر اُسے احساس ہوا کہ وہ بے سود چیخ رہی ہے۔ اس طوفانی بارش میں اس کی آواز دوسری کار کے ڈرائیور تک کیسے پہنچ سکتی تھی۔ مایوس ہو کر اُس نے عقب نما آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی کہ متعاقب کار کا میک اور ماڈل کون سا ہے لیکن ایک تو عقبی شیشے پر بارش کسی چادر کی طرح پھیل رہی تھی' اس پر پچھلی کار کی ہیڈلائٹس کی تیز روشنی۔ وہ کچھ بھی نہ دیکھ سکی۔

تنگ آ کر اس نے اپنی توجہ سڑک پر مرکوز کرلی۔ سڑک پر آگے ایک دوراہا تھا۔ ایک راستہ نوشہرہ کی طرف جاتا تھا۔ اُمید کو معلوم تھا کہ دوسری سڑک پر ایک پٹرول پمپ ہے جو رات بھر کھُلا رہتا ہے۔ وہاں سے اُسے مدد مل سکتی تھی۔ اُس نے ایکسیلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ تعاقب کرنے والی کار کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ وہ اب بھی اس کی کار کی ٹیل لائٹس سے چپکی ہوئی تھی۔ پٹرول پمپ کے قریب پہنچنے کے باوجود اُمید نے نہ تو انڈیکیٹر سے اشارہ دیا اور نہ رفتار کم کی۔ اُس نے گاڑی اچانک ہی پٹرول پمپ کی طرف موڑی اور پھر بریک دبا دیا۔

اب اُس کے اطراف میں صرف بارش تھی اور اندھیرا تھا۔ تعاقب کرنے والی گاڑی کی ہیڈلائٹس کا گردوپیش میں نام ونشان بھی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس بار کار نے اُس کا پیچھا نہیں کیا تھا۔ اُس نے سر گھما کر دوسری کار کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اسے کہیں کچھ بھی نظر نہیں آیا لیکن ایک عجیب سا احساس اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا کہ کوئی اُسے دیکھ رہا تھا......... کوئی اُس پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کوئی دبی دبی آواز تھی یا نقل و حرکت کا احساس یا اُس کی جبلت جو اُسے بتا رہی تھی کہ تعاقب کرنے والی کار اُس کے قریب ہی کہیں موجود ہے۔

پھر گولی چلنے کی بہت ہلکی آواز نے سناٹے کو مجروح کر دیا۔ ساتھ ہی اس کی کار کی عقبی ونڈشیلڈ شیشے کے ٹکڑے اُڑے' وہ جبلّی طور پر جُھک گئی۔ چند لمحے بعد اُس نے سر اٹھایا۔ ونڈشیلڈ میں دو واضح سوراخ موجود تھے......... گولیوں کے سوراخ۔ اُن کے علاوہ ونڈشیلڈ پر لکیروں کا جال سا بن گیا تھا۔

☆=========☆=========☆

پولیس والے کار کا معائنہ کر رہے تھے۔ ونڈشیلڈ اُن کی خصوصی توجہ کا مرکز تھی۔ اُمید کو جھرجھری سی آ گئی۔ "آپ ٹھیک تو ہیں بیگم صاحبہ؟" گلزار نے پوچھا۔ وہ اُس کے برابر ہی کھڑا تھا۔

اُمید نے سر اٹھا کر اُسے دیکھا۔ "گلزار......... کوئی مجھے قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔" اُس نے کشیدہ لہجے میں سرگوشی کی۔ "خانم الماس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ وہ خواب نگر کے حصول کے لیے قتل بھی کر سکتا ہے مگر اُس وقت مجھے یقین نہیں آیا تھا........."

☆=========☆=========☆

امکان نے سر اٹھا کر خرم کو دیکھا۔ "کہو......... کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے تین گھنٹے کی تاخیر ہو گئی تھی۔" خرم نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر افسردگی اور احساسِ جرم کا عجیب امتزاج تھا۔ "اُمید نے بینک والوں سے زمین کے رہن شدہ کاغذات خرید لیے ہیں۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔"

"لعنت ہو۔" امکان غرایا۔ "یہ عورت آخر چاہتی کیا ہے؟" وہ بڑی بے بسی سے چھت کو دیکھنے لگا۔

"پچھلے ہفتے وہ دو زمینیں خرید کر میں مطمئن ہو گیا تھا کہ اب وہ کچھ نہیں کر سکے گی۔ اب پتا چلا ہے کہ ان دونوں قطعات کی اس کے منصوبے میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اصل اہمیت بیدار بخت کی زمین کی تھی۔" خرم نے سوگوار لہجے میں کہا۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر امکان کی آنکھوں میں جھانکا۔ "وہ جیت گئی ہے نا؟" اس نے بچوں کے سے انداز میں پوچھا۔

"جب تک میرے دم میں دم ہے' ایسا نہیں ہو گا' میرے لیے اسلام آباد کی فلائٹ میں سیٹ بک کراؤ۔ میں ڈیم کے لیے منظوری لے کر ہی آؤں گا۔"

خرم نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی فائدہ نہیں امکان۔ ابھی میں ماریہ سے بات کر کے یہاں آیا ہوں۔ خواب نگر کو تاریخی اہمیت کے حامل مقام کی حیثیت سے رجسٹر کرایا جا چکا ہے اب ڈیم کے لیے منظوری نہیں مل سکتی۔"

اس بار امکان نے کچھ نہیں کہا۔ وہ خاموش کھڑا دفتر کی کھڑکی سے باہر درختوں کو گھورتا رہا۔ وہ تیزی سے کوئی ممکنہ حل سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر کوئی حل ممکن نہیں تھا۔ اُمید نے ہر ممکنہ راستے پر ایک بلند دیوار کھڑی کر رکھی تھی۔

"میں رکا رہوں؟"

"نہیں۔" امکان کی تیز آواز میں پتھروں کی سی سختی تھی۔ "مجھے کچھ سوچنا ہے' تنہا چھوڑ دو مجھے۔"

☆==========☆==========☆

لائبریری کی کھڑکیوں پر اندھیرے اتر آئے تھے۔ اُمید کان سے ریسیور لگائے ساکت وصامت بیٹھی تھی۔ وہ دوسری طرف سے بولنے والے کی دھمکی مکمل ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے وجود میں غصہ کسی طوفان کی طرح چیخ رہا تھا۔

کلک کی آواز سنتے ہی اس نے ریسیور رکھا اور کیسٹ ریکارڈر آف کر دیا۔ پھر اس نے کیسٹ ری وائنڈ کیا اور پلے کا بٹن دبایا۔ پوری ریکارڈنگ سننے کے بعد وہ مطمئن ہو گئی۔ اس نے دھمکی لفظ بہ لفظ ریکارڈ کر لی تھی۔

کیسٹ ریکارڈر آف کر کے اس نے ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو.......... امکان اسپیکنگ۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

اُمید نے طمانیت بھری سانس لی۔ دھمکی دینے والی آواز یقینی طور پر امکان کی ہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد سفاک مسکراہٹ ابھر آئی۔ "ہے نا حیرت کی بات؟ ابھی تم فون کے پاس سے اٹھ بھی نہیں سکے ہو گے کہ جوابی فون نازل ہو گیا۔ پہلی گھنٹی پر ریسیور اٹھایا ہے تم نے۔"

"اُمید؟" امکان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تمہیں توقع نہیں تھی نا کہ یہ میرا فون ہو گا۔ میں نے سوچا' تمہیں فون کر کے بتا دوں ۔ میں جانتی ہوں کہ تم کیا کر رہے ہو لیکن تم اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکو گے' تم مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ' تب بھی خواب نگر تمہیں نہیں ملے گا۔ تم اس پر قدم بھی نہیں دھر سکو گے۔ میں نے پکا بندوبست کر لیا ہے۔ اب مجھے فون پر دھمکیاں دینا چھوڑ دو۔"

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو اُمید؟ میں تمہیں قتل کروں..........! کر سکتا ہوں کیا؟ اور یہ فون پر دھمکیوں کا کیا سلسلہ ہے؟"

اُمید کے لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ اور کشادہ ہو گئی۔ "مجھے یہ توقع تھی بھی نہیں کہ تم اعتراف کر لو گے۔"

"یہ کیا بکواس ہے تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" اس بار امکان کے لہجے میں برہمی تھی۔

"ممکن ہے' اس طرح تمہاری یادداشت تازہ ہو جائے۔" اُمید نے کہا اور ٹیپ ریکارڈر آن کر کے ماؤتھ پیس اس کے اسپیکر پر رکھ دیا۔ وہ سرد اور مشینی آواز سنتے ہوئے اس کے جسم پر پھر تھرتھری سی دوڑ گئی۔ وہ آواز کہہ رہی تھی.......... "تمہاری خوش قسمتی اب تمہارا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ جلد ہی تم ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جاؤ گی۔"

پیغام مکمل ہونے کے بعد اُمید نے ٹیپ ریکارڈر آف کیا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے امکان کہہ رہا تھا۔ "او مائی گاڈ.......... یہ آواز! یہ سب کیا ہے؟"

"یہ آواز تمہاری نہیں ہے۔ تم نے آواز بدلنے کی کوشش کرنے کے بجائے یہ طریقہ اختیار کیا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں اس دھمکی کی ایک کاپی پولیس کو دوں گی۔ پولیس کو مجھ پر ہونے والے قاتلانہ حملوں کا علم ہے مجھے کچھ ہو گیا تو پولیس اب براہِ راست تم تک پہنچے گی۔ یوں مجھے مرنے کے بعد بھی اطمینان رہے گا کہ خواب نگر تمہیں نہیں مل سکا۔ تم تو اپنے کیے کی سزا بھگت رہے ہو گے' سمجھے!" یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا۔ یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ چند لمحے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر اس نے ریکارڈر سے کیسٹ نکالا اور بڑی بے تکلفی سے ایک کاغذ پر فون کال کی روداد لکھنا شروع کر دی۔ اس نے کال کا وقت اور دورانیہ لکھا۔ پھر اس کے فوراً بعد امکان کو فون کرنے کا احوال اور اس سے ہونے والی گفتگو لفظ بہ لفظ لکھی۔ پھر اس نے وہ کاغذ اور کیسٹ ایک لفافے میں رکھ کر لفافے کو سر بہ مُہر کر دیا۔

اب وہ خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اسے

نچوڑ کر رکھ دیا ہو' سینے کے نہاں خانے میں اب کوئی جذبہ نہیں بچا تھا۔ اس نے اس نظریے کے خلاف بھرپور جنگ کی تھی کہ امکان اسے نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کر سکتا ہے۔ اتنی بھرپور جنگ کی تھی کہ اب شکست تسلیم کرنے کی صورت میں وہ سب کچھ ہار گئی تھی۔ ہر جذبے سے محروم ہو گئی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ درحقیقت اس کے اندر.......... بہت گہرائی میں یہ یقین موجود رہا تھا کہ امکان کو اس کی پرواہ ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے لیکن اب یہ ثابت ہو گیا تھا کہ یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ فریبِ محبت کا آخری پردہ بھی چاک ہو گیا تھا۔

"میرے خدایا!" اس نے بے حد دکھ سے سوچا۔ "یہ میں کیا بن گئی ہوں۔ ایک تلخ' بے مہر عورت جسے صرف انتقام کی دھن ہے۔ اسے بیدار بخت اور اس کی بیٹی زرینہ کی وہ سرتوڑ کوششیں یاد آئیں جو انہوں نے اپنی زمین کو بچانے کے لیے کی تھیں۔ اسے اپنا سفاک' بے رحم رویہ.......... اپنا خوفناک استقلال یاد آیا۔ اُس نے ان لوگوں کو اس زمین سے محروم کر کے دم لیا تھا۔ گویا ضمیر ہاشمی نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا درست تھا۔ وہ بے رحم اور منتقم مزاج ہو گئی تھی۔ وہ امکان سے نفرت کرتی تھی مگر وہ امکان سے مختلف بھی تو نہیں رہی تھی۔ وہ برا تھا تو وہ خود کون سی اچھی تھی۔ شاید وہ انتقام کی خواہش میں اس سے زیادہ بری بن گئی تھی۔

اسے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ جیتے جی خود کو مُردہ سمجھ رہی تھی۔ نہ وہ کچھ محسوس کر سکتی تھی اور نہ ہی اسے کسی چیز کی پروا تھی۔ اسے نہ جانے کیا کیا کچھ کرنا تھا مگر اب تو سب کچھ غیر اہم سا ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ دیر تک یونہی سُن سی بیٹھی رہی.......... بے حس' بے پروا۔ پھر کلاک نے صبح کے چار بجائے۔ وہ چونکی اس نے میز پر رکھی ہوئی وہ رپورٹ اُٹھائی جو دھمکی والا فون ریسیو کرنے سے پہلے وہ پڑھ رہی تھی۔ اس نے رپورٹ پڑھنے کی کوشش کی' مگر اپنی توجہ رپورٹ پر مرکوز نہ کر سکی۔

مکان کے عقبی حصے کی سمت سے عجیب سی آواز سنائی دی.......... کسی دروازے کے قبضوں کے سرکنے کی آواز۔ اُمید ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئی۔ اُس کا وجود ہمہ تن سماعت ہو گیا۔ پھر اُس نے اس آواز کو نظرانداز کر دیا۔ پرانے مکان ایسی آوازیں اکثر

نکالتے ہیں۔ تاہم اُس کی سماعت پوری طرح بیدار ہو گئی۔ اُسے آواز کے علاوہ بھی کئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اُن میں اُس کی دھڑکنوں کی آواز بھی تھی اور ہاتھ میں موجود رپورٹ کے کاغذ کی سرسراہٹ بھی۔

پھر باہر کسی جھاڑی سے سرسراہٹ کی آواز اُبھری۔ اُمید بُری طرح چونکی۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی میں ایک چہرہ نظر آیا۔ امکان کا چہرہ! وہ شاک کی حالت میں اُس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ اُس کے چہرے کے تاثر کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید وہ بے صبرے پن کا اور شدید غصے کا تاثر تھا۔ پھر اُمید کی نظریں امکان کے ہاتھ کی طرف اٹھیں۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اُمید نے ریوالور سے نظریں ہٹا کر پھر امکان کے چہرے کو دیکھا۔ وہ کھڑکی کو دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا مگر موٹے شیشے کی وجہ سے اُس کی بات کمرے میں سُنی نہیں جا سکتی تھی۔

اُمید نے انٹر کام اٹھایا تاکہ گلزار کو مدد کے لیے بلائے مگر انٹر کام ڈیڈ تھا۔ وہ دہشت کے عالم میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ امکان بدستور کھڑکی پر زور آزمائی کر رہا تھا۔ اُمید کو اپنی ٹانگیں بے جان محسوس ہوئیں۔ اس نے میز کے عقب سے نکل کر.......... دروازے کی طرف لپکنے کی کوشش کی مگر اُس کی بے جان ٹانگیں اُس کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھیں۔

امکان پھر چلایا۔ اس بار اُس کی آواز اُمید کی سماعت تک پہنچ گئی۔ وہ چیخ رہا تھا۔ "نہیں اُمید' نہیں.........."

"اُمید نے پلٹ کر اسے دیکھا پھر دروازے کی طرف بھاگی لیکن ٹھٹک کر رہ گئی۔ ایک سایہ ریوالور ہاتھ میں لیے دروازہ گھیرے کھڑا تھا۔ اُمید کے لیے لائبریری سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اُمید سائے کو صرف ایک نظر دیکھ سکی۔ پھر اسے اپنے جسم میں جیتی جاگتی آگ سی اترتی محسوس ہوئی۔ اسی لمحے عقب سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ اُمید چکرا کر گری۔ اُس کا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆==========☆==========☆

اُسے اپنے ہاتھ پر کسی کی مضبوط انگلیوں کی گرفت محسوس ہوئی۔ ان انگلیوں سے زندگی کی حرارت اس کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی تھی۔ پھر وہ حدت اسے شعور کی سطح پر

لے آئی۔ وہ آہستہ آہستہ یوں ہوش میں آئی جیسے کسی گہری نیند سے بیداری ہو رہی ہو۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ آنکھیں کھولتے ہوئے بھاری پن کا احساس ہوا۔ نرس اُس کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی۔ نرس کے برابر ہی گلزار کھڑا تھا۔

"میں یہاں.........." اُمید نے اپنی یادداشت کو ٹٹولا۔ ذہن کے پردے پر دھندلائے ہوئے مناظر اُبھرنے ڈوبنے لگے۔ سیاہ پوش سایہ.......... ریوالور.......... امکان نے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور اب وہ اسپتال میں تھی۔

"آپریشن کرکے گولی نکال لی گئی ہے۔" نرس نے مسکراتے ہوئے اُسے بتایا۔ "اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔"

"مجھے امکان صاحب نے فون کرکے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔" گلزار نے کہا۔ "میں اسپتال پہنچا۔ آپ کا خون بہت ضائع ہوگیا تھا۔ بہرحال' ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ محض چند روز میں آپ بھلی چنگی ہو جائیں گی۔"

اُمید چند لمحے سوچتی رہی' پھر اُس نے وہ بات پوچھی' جو وہ نہیں پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر حقیقت جاننا بھی ضروری تھا۔ "کیا امکان کو گرفتار کرلیا گیا ہے؟"

"امکان صاحب کو؟ انھیں کیوں گرفتار کیا جاتا!" گلزار کے لہجے میں حیرت تھی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں نرماہٹیں اُتر آئیں۔ "کسی کی زندگی بچانا جرم تو نہیں۔ امکان صاحب نہ ہوتے تو اِس وقت خدانخواستہ آپ.........."

"لیکن میں نے امکان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔ میں نے خود دیکھا.........."

"آپ سمجھ رہی ہیں' امکان صاحب اس سازش میں ملوث تھے لیکن ایسا نہیں ہے بیگم صاحبہ! وہ تو اُسے روکنے آئے تھے۔"

"کسے؟ کس کی بات کر رہے ہو تم؟" اُمید کی اُلجھن اور بڑھ گئی۔ اُس نے ٹٹولنے والی نگاہوں سے گلزار کے چہرے کو دیکھا۔ وہ اُس کی بات پر یقین کرلینا چاہتی تھی مگر ڈر بھی رہی تھی۔ "کس کی بات کررہے ہو؟" اُس نے دہرایا۔ وہ تیزی سے کوئی ممکنہ نام سوچنے کی کوشش کررہی تھی۔

"مَیں امکان کی سیکریٹری ماریہ کی بات کررہا ہوں۔" گلزار نے نرم لہجے میں کہا۔

"ماریہ؟" اُمید کا دماغ گویا بھک سے اُڑ گیا۔ وہ اور اُلجھ گئی۔ "لیکن کیوں؟ ماریہ کو مجھے قتل کرنے کی کوشش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ مَیں نے کبھی اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ مجھ سے اس کا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔"

"اُس سے نہیں' امکان صاحب سے تو تھا۔"

اُمید نے گہری سانس لی۔ امکان کے الفاظ اُس کی سماعت میں گونجنے لگے۔ ماریہ تمھارے لیے کسی ساس سے کم ثابت نہیں ہوگی۔ ہاں' ماریہ۔ اُس نے سوچا۔ "ماریہ کی زندگی کے لیے امکان سورج کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اُس کی محبوب ہستیوں کو محبوب رکھتی ہے تو اُس کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھتی ہوگی۔"

"ماریہ کا خیال تھا کہ خواب نگر پر امکان صاحب کا حق مسلمہ ہے۔ وہ آپ کو مٹا دینا چاہتی تھی۔ اس طرح وہ امکان کو ایک اور ابدالی خاتون کے دیئے ہوئے زخموں سے محفوظ کرسکتی تھی۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

"آپ کو علم نہیں۔ امکان صاحب کا بچپن اور لڑکپن خواب نگر میں گزرا ہے۔ خانم الماس نے اس عرصے میں انہیں بہت اذیتیں دیں۔ اُن کا خیال تھا کہ سنپولیے کا سر پہلے ہی کچل دینا چاہیے۔ امکان صاحب نے یہاں بہت دُکھ اُٹھائے' کُتے کی سی زندگی گزاری۔ انھیں سگی خالہ سے محبت کی بجائے شدید نفرت ملی لیکن وہ اپنے باپ سے مختلف ثابت ہوئے۔ انہوں نے ٹھوکریں کھائیں' بے پناہ محنت کی اور اپنی دنیا آپ تعمیر کی لیکن خانم الماس نے پھر بھی اُنہیں تسلیم نہیں کیا۔ وہ انہیں سنپولیا ہی کہتی رہیں۔ خاندانی عداوتوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ امکان صاحب کو اس گھر سے' اس جاگیر سے نفرت ہوگئی۔ وہ جانتے تھے کہ یہ سب کچھ انہیں ورثے میں ملے گا۔ وہ نفرت کی اس یادگار کو مٹا دینا چاہتے تھے.........."

"مگر تم بھی تو امکان سے نفرت..........؟"

"ہاں' بیگم صاحبہ!" گلزار نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "کچھ تو یہ ہے کہ ہماری پشتوں نے اس خاندان کا نمک کھایا ہے اور پھر ہمیں بھی اس زمین سے محبت ہے۔ ہم اسے تباہ ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے۔ مگر اب مجھے احساس ہوا ہے کہ امکان صاحب بھی اپنی جگہ

درست تھے۔ اب جو ہو سو ہو۔"

اُمید نے تکیے سے سر ٹکالیا اور چھت کو گھورنے لگی۔ اُس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ اُسے سب کچھ یاد آرہا تھا۔ الماس ابدالی کی امکان سے بے اندازہ نفرت۔ پھر اُس کی موت کے بعد گلزار کا بار بار کہنا کہ وہ الماس ابدالی جیسی ہوگئی ہے۔ پھر ایک دن امکان نے اُسے اپنے بچپن کے متعلق بتایا تھا کہ خانم الماس اُس پر کس کس طرح ظلم توڑتی تھیں۔ انہیں یہ خیال نہیں آتا تھا کہ اُس کا باپ کچھ بھی سہی' اُس کی ماں تو ابدالی ہی تھی لیکن بعد میں خود اُس نے بھی امکان کے ساتھ وہی کچھ کیا جو الماس کرتی آئی تھی..........

بلکہ شاید اس سے بھی سوا۔

"میں نے سب کچھ تباہ کردیا۔ میں کیا تھی اور کیا ہوگئی۔" اُمید نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ "میں حیران ہوں کہ امکان نے مجھے بچانے کی.......... ماریہ کو روکنے کی کوشش کیوں کی؟" اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر پوچھا۔ "اسے ماریہ کے ارادے کا علم کیسے ہوا؟"

"آپ نے امکان صاحب کو فون کرکے کوئی کیسٹ سنوایا تھا بس وہ آواز انھیں اس کمپیوٹر کی سی لگی جو انھوں نے حال ہی میں درآمد کیا تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ماریہ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر اُن کا ماریہ سے رابطہ نہ ہوسکا۔ پھر وہ خواب نگر آئے۔ انھیں کوئی آدھا میل دور ماریہ کی کار کھڑی نظر آئی۔ اُنھیں اندازہ ہوگیا کہ ماریہ کے عزائم کیا ہیں۔ کہانیوں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں' ٹھیک کہتے ہو تم؟"

"مجھے صرف چند منٹ ٹھہرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اَب میں چلتا ہوں بیگم صاحبہ۔"

"پھر آؤ گے نا؟"

"جی ہاں' مگر فی الوقت آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔" گلزار نے کہا۔ پھر چند لمحے ہچکچانے کے بعد بولا۔ "امکان صاحب باہر موجود ہیں۔ وہ ایک منٹ کے لیے بھی وہاں سے نہیں ہٹے ہیں۔ وہ ملنا چاہتے ہیں آپ سے۔"

اُمید کے منہ سے ہلکی سی مسرت بھری چیخ نکلی۔ اُس نے کوشش کہ زیادہ توقعات

وابستہ نہ کرے وہ خود کو درگزر کا مستحق نہیں سمجھتی تھی۔ "میں.......... میں اُس سے ملوں گی۔" اُس نے ہیجانی لہجے میں کہا۔

"میں ابھی انھیں بھیجتا ہوں۔"

☆==========☆==========☆

امکان کمرے میں داخل ہوا۔ اُس کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ اُسے دیکھ کر اُمید کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے لیکن اُس نے اپنی نسوانی انا کے نام پر ضبط کی انتہا کردی۔ اُسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ غلطی پر تھی مگر نسوانی غرور اب بھی اُسے سرجھکانے سے روک رہا تھا۔

امکان بستر کی پائینتی کے قریب رُکا اور کھڑا اُسے بغور دیکھتا رہا۔ اس کا داہنا ہاتھ گلے میں پڑی ہوئی پٹی سے اٹکا ہوا تھا۔ اُمید اپنا نسوانی غرور اور انا' سب بھول گئی۔

"تم.......... تم زخمی ہو؟" اس نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

امکان نے اپنے ہاتھ کو یوں دیکھا جیسے اِس سے پہلے اُس سے بے تعلق رہا ہو۔ پھر اُس نے بائیں ہاتھ سے اُسے چھوا۔ "معمولی سا زخم ہے۔ ہڈی بچ گئی خوش قسمتی سے۔ کل یہ پٹی بھی کُھل جائے گی۔"

"مجھے خوشی ہوئی یہ سُن کر۔" اُمید نے کہا۔ اسے اپنے اور امکان کے درمیان حائل سنگین خاموشی اور کشیدگی کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی' کاش' یہ سب کچھ ختم کرنے کی کوئی صورت ہوتی۔ "مجھے ماریہ کے بارے میں سُن کر دکھ ہوا۔" بالآخر اس نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے' تمہارے لیے وہ کتنی اہم تھی۔"

"تو تمہیں پتا چل گیا؟" امکان نے پوچھا۔ اُس کی آنکھوں میں دُکھ کا سایہ سا لہرا گیا۔

"ہاں۔ گلزار نے مجھے بتایا۔ تم نے میری جان بچائی۔ میں.........."

"تم خطرے میں پڑیں تو یہ قصور بھی تو میرا ہی تھا۔" امکان کے لہجے میں احساسِ جرم تھا.......... پچھتاوا تھا۔ "اُمید.......... میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ خواب نگر تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔"

یہ سُن کر اُمید کو اپنی اُمیدیں دم توڑتی محسوس ہوئیں۔ پھر اسی منحوس زمین کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ مسئلہ اب بھی وہی تھا۔

امکان اُس کے احساسات سے بے خبر، کہتا رہا۔ "میں تم سے خواب نگر چھیننے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، تم نے جتنی اذیتیں اٹھائیں، وہ زمین اتنی قیمتی ہرگز نہیں تھی۔ خدا جانتا ہے، میرے نزدیک تمہاری زندگی کے مقابلے میں اس زمین کی کوئی حیثیت نہیں تھی.......... دو کوڑی کی بھی نہیں۔" اُس کے لہجے میں سچائی تھی، بے پناہ محبت تھی۔

"مجھے وہ زمین نہیں چاہیے۔" اُمید کے لہجے میں احتجاج تھا۔ وہ خود بھی اپنے لہجے کی شدت پر حیران رہ گئی۔ اُس نے خود کو ٹٹولا۔ مگر جو کچھ اُس نے کہا، سچ تھا۔ "اس زمین کی خاطر اتنے غلط کام کیے گئے.......... کس کس کو کتنی اذیتیں ملیں اور اب خون بھی بہنے لگا۔ مجھے اس زمین سے کوئی سروکار نہیں۔"

"کل رات بہت سوچنے کے بعد میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

"ایک دو دن میں میں شمشاد سے بات کروں گی۔ ہم وہ زمین حکومت کو دے دیں گے۔ وہ جو مناسب سمجھے، کرے۔"

"اور اس سلسلے میں کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو میں بھی حاضر ہوں۔"

"شکریہ۔" اُمید نے خوش ہو کر کہا لیکن پھر وہ اُداس ہوگئی۔ اب وہ زمین ہی ایک ایسا تعلق تھا جس کے بہانے وہ امکان سے مل سکتی تھی۔ یہ قضیہ طے ہوجانے کے بعد ملاقات کا امکان ختم ہوجاتا اور وہ امکان سے بار بار ملنا چاہتی تھی۔ اُسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ امکان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ اب بھی اُس سے پہلے جیسی محبت کرتی تھی۔

اُسی وقت ایک نرس کمرے میں چلی آئی۔ وہ امکان کو دیکھ کر مسکرائی اور نرم لہجے میں بولی۔ "اب آپ نہیں رُک سکتے۔"

امکان واپس جانے کے لیے مڑا۔ اُمید کو احساس ہوگیا کہ اگر اُس نے یہ لمحہ ضائع کر دیا تو پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ "امکان!" اُس نے پکارا۔ امکان نے پلٹ کر سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ "کیا بہت دیر ہوگئی؟ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟" اُس کے لہجے میں عجیب سی التجا تھی۔

امکان کی آنکھوں میں وہی چمک لہرائی جو اُمید کو محبت کے حوالے سے آج بھی یاد تھی۔ اُس کی نگاہوں میں گرم جوشی سی اُبھری۔ "نہیں اُمید.......... اتنی دیر کبھی نہیں

ہوتی کہ کچھ بھی نہ ہوسکے۔ بشرطیکہ ہم خود یہ نہ چاہیں۔"

"میں تو یہ نہیں چاہتی۔"

"میں نے تو پہلے بھی کبھی یہ نہیں چاہا۔ میں تو تمہیں کھونا ہی نہیں چاہتا تھا۔"

وہ بستر کی طرف پلٹ آیا۔ اُمید نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ امکان کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھرکنے لگی، جو اُمید کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر دیتی تھی۔ اُمید کو یقین ہوگیا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔

"دیکھیے جناب.........." نرس نے مداخلت کی۔

"میں جا رہا ہوں۔" امکان نے کہا۔ وہ اُمید کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ "لیکن میں واپس آؤں گا۔" اُس نے جُھک کر اُمید کی پیشانی چوم لی۔ "دوسری ملاقات تک کے لیے خدا حافظ۔"

اُمید ہنس دی۔ پھر سرگوشی میں بولی۔ "دوسری ملاقات تک کے لیے.........."

اب وہ مطمئن تھی۔ اُمید زندہ تھی..........

===== ختم شد =====